

قرآن مجید کے ادبی اسالیب

عبداللہ فہد فلاحی



Q
297.16
ف 848 ق
95687

DATA ENTERED

قرآن مبین کے ادبی اسالیب

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

۲۹۷۶۱۴

مطبوعات ہیومن ویلفیئر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) نمبر ۲۷۹
© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

۹۵۶۱۷

نام کتاب : قرآن مبین کے ادبی اسالیب
مصنف : ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی
صفحات : ۲۰۸
ناشر : مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز
ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵
فون: ۶۹۱۱۶۵۲، ۶۳۱۷۸۵۸، فیکس: ۶۸۲۰۹۷۵
E-Mail : mmipub @ nda.vsnl.net.in

اشاعت :

۱،۰۰۰

اگست ۲۰۰۰ء

باراؤل :

قیمت: -/۵۰ روپے

QUR'AN MOBEEN KE ADABI ASALEEB (Urdu)
By Dr. Obaidullah Fahad Falahi

Price : Rs. 50.00

فہرست

	حرف آغاز
۷	صاحب لسان العرب کی رائے
۷	علامہ ابن خلدون کی رائے
۸	اسلوب کی لازمی خصوصیات
۱۱	وضاحت
۱۱	وضاحت فکر
۱۱	وضاحت ترکیب
۱۳	قوت تاثیر
۱۴	قوت تصویر
۱۵	قوت ترکیب
۱۶	جمال و رعنائی
۱۶	سلبی گوشہ
۱۷	ایجابی گوشہ
۱۸	موضوع پر اسلاف کی خدمات
۱۹	اسلوب قرآن اور اس کی خصوصیات
۲۱	قرآن مبین کے بعض اسالیب
۲۵	۱- عود علی البدء
۲۵	۲- علی سبیل المشاکلہ
۲۹	۳- نبی کے ساتھ قنید
۳۳	۴- تشریف
۳۷	۵- تخلص
۳۹	

۴۳

۵۰

۵۱

۵۴

۶۰

۶۱

۶۲

۶۳

۶۵

۶۷

۶۸

۶۹

۷۰

۷۱

۷۳

۷۳

۷۴

۷۶

۷۷

۷۷

۷۹

کیا تکرار کا یہ اسلوب بنی اسرائیل کے لیے خاص تھا؟

جاہلی شعراء اس اسلوب سے مانوس تھے

اس اسلوب کے بعض فوائد

قصوں کی تکرار

تکرار کی اصل حکمت

قصہ آدم و ابلیس

سورہ اعراف میں

سورہ حجر میں

سورہ بنی اسرائیل میں

سورہ طہ میں

سورہ ص میں

سورہ کہف میں

قصہ ابراہیم مختلف سورتوں میں

سورہ انعام میں

سورہ توبہ میں

سورہ ہود میں

سورہ ابراہیم میں

سورہ مریم میں

سورہ انبیاء میں

-۷ قسم

قسم کا مقصد

قرآن پاک سے مثالیں

مقسم علیہ کی مختلف شکلیں

توحید

اثبات رسالت

۸۹	قرآن کی حقانیت پر دلیل
۹۰	آخرت کی دلیل
۹۰	انسانوں کی ناشکری پر دلیل
۹۰	تحکیم رسول پر دلیل
۹۱	قسم کی بلا غتیں
۹۳	۸۔ مخاطب
۹۹	چند ضروری نکات
۱۰۱	التفات
۱۰۳	التفات کے فوائد
۱۰۹	۹۔ قرآن و وصل
۱۱۱	۱۰۔ حذف
۱۱۱	مواقع حذف
۱۳۱	۱۱۔ استفہام
۱۴۳	۱۲۔ نفی
۱۵۱	۱۳۔ حال
۱۵۵	۱۴۔ وصف
۱۶۱	۱۵۔ اعتراض
۱۶۷	۱۶۔ تکمیل
۱۷۱	۱۷۔ عطف بالواو
۱۷۵	۱۸۔ ابہام کے بعد توضیح
۱۷۹	۱۹۔ تنکیر کے کچھ خاص اصول
۱۸۵	خلاصہ
۱۸۹	حواشی و تعلیقات
۲۰۱	کتابیات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حرف آغاز

جب اسلوب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو معاً ایک ایسے لفظی عنصر کی تصویر ذہن میں آتی ہے، جو کلمات، جملوں اور عبارتوں سے مرکب ہے بلکہ بسا اوقات اسے دوسرے علوم و فنون سے کاٹ کر صرف ادب تک محدود سمجھ لیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم صحیح ہونے کے باوجود جامع اور ہمہ گیر نہیں ہے اس لیے کہ یہ لفظی تصویر پایہ دار زندگی نہیں حاصل کر سکتی۔ یہاں تو لغوی نظام سے آگے ایک ایسے معنوی نظام کی بھی ضرورت ہے، جو خود مضمون نگار اور مصنف کے ذہن میں موجود ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ مرتب و منظم الفاظ کے وجود سے پہلے عقل و خیال کی مرکزیت اور فکر و نظر کی تنظیم ضروری ہے۔

ایک مشکل یہ بھی ہے کہ لفظ اسلوب مختلف میدانوں اور جہتوں میں قدر مشترک بن کر رہ گیا ہے علماء اور محققین اسے ایک علمی طریقہ کار کے معنی میں بولتے ہیں، ادباء و شعراء اسے فن ادب میں محصور سمجھتے ہیں اور موسیقی کار اسے نغموں کی ترتیب اور صوتی ہم آہنگی کے لیے دلیل راہ تصور کرتے ہیں۔

صاحب لسان العرب کی رائے:

علامہ ابن منظور نے اپنی کتاب میں اسلوب کی تعریف اس طرح کی ہے:

”کھجوروں کی کیاری کو اسلوب کہتے ہیں، ہر وسیع اور لمباراستہ بھی اسلوب کہلاتا ہے۔ معنوی مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے انتم فی اسلوب سوء، تم نے غلط طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ اسلوب اس عام شاہ راہ کو بھی کہتے ہیں، جس پر انسان چلتے ہیں اسلوب کے معنی فن کے بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے أخذ فلان فی أسالیب من القول ای أفانین

مند، یعنی فلاں نے مختلف فنون سے دلچسپی لی“ (۱)

صاحب لسان العرب کی اس تعریف کی روشنی میں ہم اسلوب کی دو قسمیں قرار دے سکتے ہیں:

۱۔ حسی اسلوب جو لفظ کی اولین ساخت کی نمائندگی کرتا ہے۔

۲۔ معنوی اسلوب، جو لغوی ساخت کا اگلا قدم ہے اور جہاں کلمات حسی مفہوم کے دائرے سے نکل کر ادبی و نفسی معانی کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ اسلوب کلام کا ایک فن ہے، خواہ وہ قصص و واقعات کی شکل میں ہو خواہ بالمشافہ گفتگو کی شکل میں تشبیہ، مجاز اور کنایہ کا پیراہن زیب تن کیے ہوئے ہو۔ یا امثال و حکم کے لباس میں جلوہ گر ہو۔ اس مفہوم کے اعتبار سے اسلوب کا مفہوم قدرے وسیع ہو جاتا ہے اس لیے یہاں لفظی عنصر سے آگے بڑھ کر معاملہ اس فن تک جا پہنچتا ہے جس کا سہارا ایک ادیب تاثیر و تفہیم کے لیے لیتا ہے۔

علامہ ابن خلدون کی رائے:

جب ہم مقدمہ ابن خلدون کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں چند مزید قیمتی باتیں معلوم ہوتی

ہیں۔ اس سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ ادبی اسلوب کی تشکیل میں علمی و فنی نقطہ ہائے نظر میں بڑا زبردست فرق ہے۔ نحو، بلاغت اور عروض کے علوم سے ہمیں صرف اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ ان سے کلام کی اصلاح میں اور قوانین نظم و نثر سے اسے ہم آہنگ بنانے میں مدد ملتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک طالب علم ان علوم سے واقف ہو لیکن اس کی انشاء پر دازی ادب کے اعلیٰ مقام پر نہ رکھی جاسکتی ہو یا یہ کہ زیادہ سے زیادہ اس کو یہ فائدہ ہو کہ اس کا کلام صحیح ہو جائے، لیکن کیا اسے حسن کلام اور تاثیر کلام کے بلند مقام پر فائز بھی کیا جاسکتا ہے؟ یہ قطعی طور پر ضروری نہیں ہے۔ لیکن خوب صورت اور شیریں اسلوب کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس کے لیے طبعی ذوق اور جگر کا ہی و ممارست درکار ہے۔

۲۔ اسلوب دراصل وہ ذہنی تصویر ہے، جو ذہن و دماغ پر حاوی ہو جاتی ہے اور مطالعہ و استفادہ سے ذوق پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔ (۲) اسی ذہنی تصویر کی نمائندگی وہ لفظی مظاہر کرتے ہیں، جن کو

(۱) لسان العرب، ابن منظور، بیروت ۱۹۵۵ء، ج: اول، ص: ۲۷۳

(۲) دیکھئے المثل السائر، ص: ۳۰، کتاب الصنائع، ص: ۱۲۷

ہم اسلوب کہتے ہیں۔

۳۔ یہ ذہنی تصویر جو اسلوب کی اولین بنیاد ہے۔ نہ جزئی معانی کا نام ہے نہ مستقل جملوں کا بلکہ یہ ایک طریقہ تعبیر ہے جسے متکلم اختیار کرتا ہے۔

۴۔ نظم و نثر میں لفظی و معنوی امتیازات دراصل اسلوب کی وجہ سے ہیں۔ نظم، وزن اور قافیہ وغیرہ کے ذریعہ ممتاز ہو جاتی ہے اور ہر شعر اپنے معنی و مفہوم میں مستقل حیثیت رکھتا ہے اور یہ اہل عرب کی خصوصیت تھی۔ اسی طرح نثر کی خصوصیت موازنہ و تشابہ تھی بسا اوقات اس میں جمع و ارسال کی تقلید بھی کی جاتی تھی۔

اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ زمانہ قدیم سے اسلوب سے مراد وہ صورتی گوشہ لیا جاتا ہے جو تعبیر و اظہار کا طریقہ تھا جسے ایک ادیب اور مصنف اظہار مافی الضمیر کے لیے اختیار کرتا ہے۔ دراصل اسلوب نام ہے ”تحریر کے طریقے کا، انشاء پر دازی کے سلیقے کا، تعبیر و تشریح کے لیے الفاظ کے انتخاب و ترتیب کا یا نظم کی قسموں کا۔ اور یہی ادبی اسلوب کی تعریف ہے۔ (۱)

دوسرے علوم و فنون سے قطع نظر خود ادب میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایجاز و اطناب، سہولت و غرابت جمال و تنافر وغیرہ کے ذریعے عبارتوں کی تشکیل میں تصرف و اختلاف ہوتا ہے لیکن ان ساری چیزوں سے پہلے تعریف و اختلاف ایک اور جگہ ہوتا ہے اور وہ ہے افکار کا انتخاب ان کی منطقی یا منتشر ترتیب، ان کی وضاحت یا ابہام، ان کی صحت یا خطا وغیرہ کا میدان اور انہیں طریقہ استقراریا طریقہ استنباط کے مطابق ڈھالنا پھر انہیں تخیل و تصویر کے قالب میں پرونا کہ مصنف تشبیہ کا طریقہ زیادہ استعمال کرے گا یا استعارے کا یا کنایہ کا؟ اور اس سلسلے میں اس کی تقلید و اجتہاد کی کیفیت کیا ہے؟ یہ وہ تمام نکات ہیں جہاں مضمون نگار، ادیب اور مصنف ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور ہر ایک اپنا اسلوب لے کر سامنے آتا ہے۔

مثال کے طور پر بڑھاپے کا تصور ہے، دیکھیے تین شعراء اسے اپنے اپنے اسلوب میں کس طرح بیان کرتے ہیں۔

معری کہتا ہے:

والشيب ازهار الشباب فماله يخفى، وحسن الروض في الازهار

(۱) مقدمہ ابن خلدون الجزء ۱۱۱، مکتبہ التجاریۃ الکبریٰ قاہرہ، ص: ۵۷۲-۵۷۰

(بڑھاپا تو دراصل جوانی کا پھول ہے پھر اسے چھپنے اور پوشیدہ رہنے کی کیا ضرورت ہے؟
چمن کا حسن تو کلیوں اور پھولوں کے دم سے ہے)
گویا معری کو بڑھاپا پھولوں کی طرح عزیز ہے، جس سے گلشن میں خوش بو پھوٹتی ہے۔
فرزدق کہتا ہے:

تفاریق شیب فی الشباب لوامع و ما حسن لیل لیس فیہ نجوم؟
(بڑھاپے کی مانگیں سفیدی سے چمک رہی ہیں، بھلا اس رات میں کیا حسن ہے جس میں
ستارے نہ نکلتے ہوں؟)

لیکن شریف رضی کہتا ہے:

غالطونی عن المشیب و قالوا لا ترع إنه جلاء حسام
قلت ما أمن من علی الراس منه صارم الحد فی ید الایام
(لوگوں نے مجھے بڑھاپے کے سلسلے میں غلط فہمی میں رکھنے کی کوشش کی، کہنے لگے
گھبرانے کی بات نہیں ہے یہ تو موت کے لیے آسانی فراہم کر دی گئی میں نے کہا بھلا اس
شخص کی بے خونی اور اطمینان کا کیا حال ہو گا جس کے سر پر تیز تلوار لٹک رہی ہو؟)

اسی طرح سیرت نگاروں کو دیکھیے ان کے طریقہ ادا، اسلوب اظہار اور انداز سیرت نگاری
میں کتنا فرق ہے مثال کے طور پر سر سید احمد خان کی خطبات احمدیہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی
نبی رحمت، علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی اور نعیم صدیقی کی محسن انسانیت کو دیکھ جائیے۔ یا عربی
میں ڈاکٹر محمد حسین بیگل کی کتاب ”حیات محمد“، توفیق الحکیم کی محمدؐ، اور طہ حسین کی علیؑ
ہامش السیرة پڑھ لیجیے ہر ایک کے یہاں منفرد رنگ، اچھوتا انداز اور جداگانہ اسلوب ہے اس
لیے اگر یہ کہا جائے کہ اسلوب دراصل طریقہ فکر، طریقہ تصویر اور طریقہ تعبیر کا نام ہے تو غلط نہ
ہوگا۔ (۱) امر واقعہ یہ ہے کہ اسلوب کی یہ آخری تعریف تمام عناصر اسلوب کو حاوی ہے گرچہ تفکیر
و تصویر کا مظہر لفظی عنصر ہی ہے۔

(۱) الاسلوب دراسة بلاغة تحليلية لأصول الأساليب الأدبية، احمد الشائب، مكتبة النهضة

لمصرية، الطبعة الرابعة، ص: ۳۶

اسلوب کی لازمی خصوصیات:

اسلوب کی متعدد خصوصیات ہو سکتی ہیں، جن کی معرفت معمولی غور و فکر سے حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں ان خصوصیات کا تذکرہ مقصود ہے جو سب پر عام، ہمہ گیر، دور رس اور مستحکم ہیں، جن کا تعلق تمام اسالیب سے ہے اور جو خود ادیب و مصنف کی شخصیت، اس کے جذبات و احساسات، ذوق و وجدان اور اس کے کلمات و عبارات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ان تمام خصوصیات کو ایک جملے میں بیان کرنا چاہیں تو اسے صدق تعبیر سے تعبیر کر سکتے ہیں اس لیے کہ ذہن و دماغ میں جو واضح فکر اور سچا جذبہ موجیں مار رہا ہے، اس کی تعبیر و تشریح میں اخلاص ہی وہ جوہر ہے جو اسلوب کو مثالی بنا دیتا ہے۔ مقصد و مدعا کے اعتبار سے خصوصیات کو تین خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ وضاحت اسلوب

۲۔ قوت تاثیر

۳۔ جمال و رعنائی

یہاں ہر خصوصیت پر قدرے تفصیل سے گفتگو کرنا مقصود ہے۔

وضاحت:

ادیب و مصنف کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مفہوم بالکل واضح، مدعا و ٹوک اور مقصد عیاں ہو تاکہ قارئین اس کی تحریروں سے مستفید ہو سکیں اور ان کا علمی و ثقافتی معیار بلند ہو سکے۔ لہذا اس کا فرض ہے کہ اس زبان میں اپنی بات کہے جسے مخاطب سمجھتے ہوں (۱) اور تکلف و تصنع سے اجتناب کرے۔ اس ضمن میں اسے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

۱۔ وضاحت فکر:

فکر خواص و عوام سب پر واضح ہو، جو بات کہنی ہے، اس میں کوئی جھول نہ ہو۔ تعقید اور

(۱) البیان والتبیین، الجاحظ جلد اول، ص: ۱۰۵

ابہام سے وہ پاک ہو۔

جیسے طغرائی کہتا ہے:

و من يستعن بالصبر نال مراده ولو بعد حين أنه خير مسعد

(اور جس نے صبر سے مدد حاصل کی وہ اپنے مراد میں کامیاب ہو گیا، چاہے اس میں ایک

مدت لگے۔ بلاشبہ وہ بہت خوش بخت اور نصیب والا ہے)

یا جیسے ابو تمام کہتا ہے:

و إذا امرءٌ مدح امرأً لنواله و أطلال فيه فقد اراد هجاءه

و لو لم يقدر فيه بعد المستقى عند الورد لما أطلال رشاءه

(اور جب کوئی آدمی کسی بڑے آدمی کی بخشش کے لیے اس کی مدح کرتا ہے اور خوب مدح

کرتا ہے تو اس سے اس کی ہجو ہونے لگتی ہے۔ اگر اس نے کنویں کی مسافت کی تعین نہ کی

تو سی لمبی نہیں کر سکتا)

فکر کی یہ وضاحت و مہارت اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ درج ذیل چیزیں اختیار کی جائیں:

(الف) متعین کلمات کا انتخاب کیا جائے، ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں، جن میں معانی کا

اشتراک پایا جاتا ہو۔ بلکہ وہی الفاظ منتخب کیے جائیں جو مفہوم کو پوری طرح ادا کرتے ہوں اس لیے

مترادفات میں جو باریک فرق ہوتا ہے اسے ملحوظ رکھنا ہوگا۔

(ب) بہتر ہو گا کہ ادیب تشریح و تقیید اور تخیل و توصیف کے عناصر کا استعمال کرے تاکہ

معانی واضح اور متعین ہو سکیں، جیسے مضاف الیہ، حال، تمیز اور استثناء وغیرہ کا استعمال ہونا چاہیے۔

جیسے ابن الرومی کہتا ہے:

كان مواهبه في المحول آراؤه عند ضيق الحيل

فلو كان غيثاً لعم البلاد و لو كان سيفاً لكان الاجل

و لو كان يعطى على قدره لأغنى النفوس و أفنى الامل

(گویا اس کی صلاحیتیں ناکامی میں نکھرتی ہیں اور اس کی رائیں اس وقت کام آتی ہیں جب

تدبیروں کا دامن تنگ ہو جاتا ہے اگر وہ بارش کرتا تو تمام ملکوں میں سیرابی کرتا اور اگر وہ

تلوار ہوتا تو پیغام اجل ہوتا اور اگر اس کے فیصلے کے مطابق بخشش اور داد و ہش کا سلسلہ

جاری کیا جائے تو لوگ مالدار ہو جائیں اور امیدیں ختم ہو جائیں)

(ج) اضداد کا استعمال ہونا چاہیے کہ اس سے معانی پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں لیکن اس میں احتیاط اور اعتدال شرط ہے۔ ورنہ مبالغہ اور غلو سے اسلوب میں خرابی پیدا ہو سکتی ہے جیسے سُختری کہتا ہے:

متی ارت الدنيا بناهة خاملٍ فلا ترقب إلا خمول بنیه

(اگر دنیا نے گنہگار شخص کو شہرت عطا کر دی ہے تو مشہور آدمی کی گنہگاری کا اب انتظار کرو)

(د) غریب اور نامانوس الفاظ سے پرہیز کیا جائے اور وہی زبان استعمال کی جائے جسے لوگ سمجھ سکیں ورنہ مقصد فوت ہو جاتا ہے اور سامعین و قارئین استفادہ سے محروم رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے:

حلال لیلیٰ أن تروع فوادہ بہجر و مغفور لیلیٰ ذنوبہا

تطلع من نفسی لیلیٰ نوازع عوارف أن الیاس منها نصیبہا

وزالت زوال الشمس عن مستقرہا فمن مخبریٰ نی ایّ أرض غروبہا

(لیلیٰ کے لیے جائز ہے کہ اس کے دل کو جدائی سے خوف زدہ کر دے کہ لیلیٰ کے جرائم قابل

عفو ہیں۔ میرے نفس کے محرکات و جذبات نے اندر ہی کہا کہ مایوسی لیلیٰ کا مقدر ہو چکی ہے۔

وہ اپنے مستقر سے سورج کی طرح ڈھل گئی لیکن مجھے کون بتائے کہ وہ کس

سرزمین میں غروب ہوئی ہے؟)

(ھ) پھر ان علمی، فنی، اجتماعی اور تاریخی اصطلاحات کا استعمال ہو جو متعین اور خاص معانی کے

لیے تشکیل دی گئی ہیں تاکہ مصنف اور قارئین کے درمیان واضح علامات اور مشترک عقلی روابط

موجود رہیں لیکن یہاں اس بات کا خیال رہے کہ خشک و بے جان، تجارتی و قانونی رنگ نہ چڑھنے

پائے جو روح و وجدان سے یکسر خالی ہو۔

۲- وضاحت ترکیب:

فکر کی وضاحت کے بعد دوسری بات جو ضروری ہے، وہ ترکیب کی وضاحت ہے یعنی وہی

ترکیب اور جملے استعمال ہوں جو واضح اور اپنے مفہوم میں صریح ہوں۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل

خصوصیات درکار ہیں:

(الف) مصنف اور ادیب کے اندر نحوی ذوق کی ضرورت ہے تاکہ کلمات کی ترتیب بہتر ڈھنگ سے کر سکے اور لبس اور غموض کی خرابیوں سے بچ سکے۔

(ب) اس بات پر مصنف کو غایت درجہ اطمینان ہو کہ کلام کے عناصر ترکیبی ایک ماہرانہ نظام اور مرتب تنظیم میں جڑے ہوئے ہیں جس سے قارئین کو مختلف اجزاء کے باہمی تعلقات ڈھونڈنے میں پریشانی نہ ہو اور بے فائدہ محنت و مشقت نہ کرنی پڑے۔

(ج) پھر جملوں کی رعایت، فصل و وصل کا خیال اور حروف علت وغیرہ کے انتخاب پر بھی نظر رہنی چاہیے مثال کے طور پر شریف رضی کے یہ اشعار دیکھیے:

و لقد وقفت علی ربوعہم و طولہا بید البلی نہب
فبکیٹ حتی ضج من لغب نصور و لج بعدلی الرکب
و تلفت عینی فمد خفیت عنی الطلول تلفت القلب

(میں ان کی قیام گاہوں پر ٹھہرا اور حال یہ تھا کہ ان کے کھنڈرات فنا کے ہاتھوں لوٹ کا سامان بن گئے تھے۔

میں رو پڑا یہاں تک کہ شور و غوغا بلند ہو اور قافلے نے مجھے تنہا چھوڑ دینے پر اصرار کیا۔ اور میری آنکھ نے دیکھا اور جب کھنڈرات نظروں سے اوجھل ہو گئے تو قلب نے توجہ کی۔) یہاں پہلے مصرع میں واو حالیہ پھر دوسرے شعر میں فاء کا استعمال اور حتی کا موقع پھر مذ کا محل اور تلفت القلب کا جملہ ہر ایک کس طرح انگشتی میں نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے۔

قوت تاثیر:

قوت تاثیر دراصل وہ نفسی و باطنی طاقت ہے، جو سب سے پہلے خود اس ادیب سے پیدا ہوتی ہے، جو دوسروں کے اندر تاثیر اور انفعال دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسروں کو متاثر کرنے سے پہلے خود اسے متاثر ہونا چاہیے دوسروں کے اندر احساس و شعور بیدار کرنے سے پہلے خود اسی کے اندر اس احساس و شعور کی بیداری ضروری ہے۔ یہ دراصل اسلوب کی صفت سے پہلے جذبات، ارادہ اور اخلاق کی صفت ہے جو مصنف حقائق پر گہری نظر رکھتا ہوگا، پیش کردہ احکام پر مستحکم اعتقاد رکھتا ہوگا اور ان کی نشر و اشاعت اور تبلیغ و تلقین سے اسے دلچسپی ہوگی اس کی جھلک اس کی تحریروں میں بھی

نظر آئے گی اور اس کے جذبات و احساسات کی گرمی اور تپش اس کے کلام میں بھی محسوس کی جاسکے گی اس مقصد کے لیے دو طریقے اختیار کیے جائیں گے!

قوت تصویر:

اس سے مراد وہ منظر نگاری ہے جو عقل سے آگے بڑھ کر جذبات و احساسات پر کمند ڈال دے۔ لفظی و حرفی مفہوم سے مجازی و استعاراتی باتوں کی طرف ذہن کو منتقل کر دے اور یہ تمثیل و تشبیہ، استعارہ و کنایہ وغیرہ، بلاغت کے اصولوں کے ذریعے ممکن ہے، جس سے مخاطب کے سامنے فکر و نظر اور خیال و تدبیر کی راہیں کھل جاتی ہیں مثال کے طور پر بشار بن برد کہتا ہے:

إذا أنت لم تشرب مراراً على القذى ظمئت و أی الناس تصفو مشاربة

(اگر تم نے گندہ پانی بار بار نہیں پیا ہے تو تم پیاسے ہی رہے بھلا کون شخص ہے جس کے

گھاٹ ہمیشہ صاف اور پاکیزہ ہوں؟)

اس شعر سے تین مطلب مراد لیے جاسکتے ہیں۔ پہلا مطلب جو ظاہری اور لفظی ہے، یہ کہ انسان کو بسا اوقات گندہ پانی بھی پینا پڑتا ہے، اس لیے کہ ہمیشہ پانی کے صاف و شیریں رہنے کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد دوست کو لیا جائے جس کے اندر کوئی نہ کوئی عیب ضرور رہتا ہے کیوں کہ کوئی انسان عیب سے محفوظ نہیں ہے اور یہی مفہوم زیادہ مناسب ہے۔ کیوں کہ بشار کو ہمیشہ لعنت ملامت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تیسرا مطلب یہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ زندگی میں زوال و ناکامی کا احتمال باقی رہتا ہے۔ کیوں کہ مطلق کامیابی غیر یقینی ہوتی ہے۔

یہاں بعض ان وسائل کا ذکر کیا جاتا ہے، جس سے قوت تصویر پیدا ہو سکتی ہے:

(الف) مانوس و مالوف الفاظ برتے جائیں، متعین اور مشخص کلمات جو پیش نظر معانی کے لیے مخصوص ہوں، استعمال کیے جائیں، مشترک مبہم اور اجنبی الفاظ نہ استعمال کیے جائیں۔

(ب) وصفی کلمات کے استعمال سے قوت تاثیر اور قوت جمال دونوں پیدا ہوتی ہے۔ اس سے صحیح منظر نگاری اور واقعہ کی حقیقی عکاسی ہوتی ہے اور سچی تصویر کشی کے ذریعہ فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر کا زور بڑھ جاتا ہے۔

(ج) کلمات کا مجازی استعمال یا ان کی نادر و غریب صفات اس سلسلے میں کافی مفید ہو سکتی ہیں۔

(د) ضعیف کلمات، زائد الفاظ اور ثانوی عناصر عبارت سے پرہیز کیا جائے اور ارکان کلام پر اکتفا کیا جائے۔

قوت ترکیب:

متکلم اپنی آواز کے زیر و بم اور تکرار و اعادہ کے ذریعے اپنی بات کو موثر بنا سکتا ہے۔ لیکن تحریر میں آواز کا در و بست کام نہیں آئے گی اس لیے صوتی وسیلے کے علاوہ کچھ اور وسائل یہاں اختیار کرنے ہوں گے۔

(الف) قصر و تفخیم، اہمیت و افادیت، تاکید و تنظیم کے لیے تقدیم و تاخیر کے قواعد اختیار کیے جائیں۔

(ب) طباق بدیع کا استعمال بھی موثر اور مفید ثابت ہوتا ہے۔

(ج) چوں کہ بیشتر اوقات قوت تاثیر کا تقاضا، سرعت ہوتا ہے، اس لیے عام طور پر یہاں ایجاز کا اسلوب کارگر ثابت ہوتا ہے۔

جمال و رعنائی:

اگر ادیب اور مصنف مخاطب کے ذوق کا احترام کرنا چاہتے ہوں اور ان کی دل چسپی کو مد نظر رکھتے ہوں، تو ان کے لیے جمال و رعنائی کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ بسا اوقات عبارت ادب کا شاہکار ہوتی ہے۔ فکر واضح کی علمبردار ہوتی ہے، جذبات کو انگینت کرنے والی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ذوق کے لیے گراں بار ہوتی ہے اور مخاطب کے مزاج اور ذوق سے میل نہیں کھاتی۔ یہ نقص اکثر تعبیر کی کمزوری سے پیدا ہوتا ہے۔ اور شعور اور ادبی ذوق سے محرومی کا پتہ دیتا ہے۔

یہ بات یہاں ذہن میں رہنی چاہیے کہ جمال کا مطلب صنائع و بدائع اور خیالی تصاویر کا استعمال نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک نفسی صفت ہے جو ادیب کے خیال اور اس کے مذاق سے جنم لیتی ہے خیال معانی کی گہرائی و گیرائی اور اس کے خوب صورت اسرار و موزوں اور اس کے مذاق سے جنم لیتی ہے۔ ذوق خوب صورت خیال کے مناسب حال بہترین اور موزوں ترین عبارت کا انتخاب کرتا ہے۔ ذوق سے ہماری سرادوہ ”مہذب ذوق“ ہے، جس کو ادب نے صیقل کیا ہو، روایت نے اسے تابندگی

بخشی ہو، ذکاوت نے اسے نکھارا ہو اسے کھرے کھوٹے میں تفریق کا ملکہ ہو اور حسین و فتیح کے درمیان تمیز اس پر آسان ہو (۱) اس طرح اسلوب کی یہ فنی صفت پیدا ہوتی ہے۔
جمال سلبی صفت بھی ہے اور ایجابی بھی۔ یہ تنافر اور وحشت سے اجتناب کا ثمرہ ہے اور ذوق و خیال کے جمال کی بازگشت ہے۔

سلبی گوشہ:

سلبی گوشہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ عبارت صوتی اضطراب کے اسباب اور درشت و تند لہجے کے سرمایے سے خالی ہو۔ اس صورت میں عبارت متحد اور ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ حروف و کلمات میں نظم و نسق پیدا ہو سکتا ہے اور باواز بلند پڑھنے سے اس میں نغمگی اور صوتی مٹھاس محسوس ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل باتیں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں:
(الف) مصنف اپنے بلند و پاکیزہ ذوق کے ذریعے تنافر حروف سے اجتناب پر قادر ہو۔ درج ذیل نمونے دیکھیے تنافر کلمات کی بہترین مثال ہیں۔ بختری کہتا ہے:

حلفت لها بالله يوم التفرق و بالوجد من قلبی بها المتعلق

(میں نے یوم انتشار کو اس سے خدا کی قسم کھائی اور اس سوزش کی بھی جو اس پر عاشق دل

کے اندر موجود تھی)

یہاں قلبی موصوف اور المتعلق صفت کے درمیان بھا کے ذریعہ جو فصل پیدا ہو گیا ہے اس نے شعر کا جمال غائب کر دیا ہے۔ شاجم کے یہ اشعار دیکھیے:

والزهر والقطر فی رباها ما بین نظم و بین نثر

حدائق کف کلّ ریح حل بها خیط کل قصر

(اس کی پہاڑیوں پر پھول بھی ہیں اور بارش بھی، منظم بھی اور منتشر بھی ہر ہوا کی ہتھیلی

کے باغات ہیں اور ہر محل کے نقش و نگار وہاں موجود ہیں)

یہاں پیہم اضافتوں نے اسلوب کی خوبصورتی چھین لی ہے۔ درج ذیل شعر پڑھیے:

ملکت مطال مولود مفدی ملیح مانع منی مرادی

(میں ایسے نوزائیدہ بچے کا مالک ہوا جس پر قربان ہوا جائے، بہت ہی خوب صورت اور میری مرادوں میں رکاوٹ ہے)

اس شعر میں تمام الفاظ کے آغاز میں میم کی تکرار نے نغمگی کو مجروح کر دیا ہے۔

(ب) اسلوب کی عام نغمگی کا خیال رکھنا ضروری ہے اور آواز کی ہم آہنگی اور ترتیب دھیان میں رہنی چاہیے۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ طویل کلمات سے اجتناب کیا جائے اور لمبے چوڑے مشابہ جملے اور عام عبارتیں نہ استعمال کی جائیں۔

ایجابی گوشہ:

اوپر جو کچھ سلبی گوشے کے سلسلے میں عرض کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ ایجابی عنصر کو رواج ملے اور جمال کے مثبت عناصر جگہ پاسکیں یعنی الفاظ و معانی میں تناسب و ہم آہنگی ہو اس تناسب و تناسب کے چند مظاہر یہ ہیں:

(الف) الفاظ و معانی میں طبعی و فطری مناسبت ہوتا کہ الفاظ صحیح معنوں میں معانی کی حکایت بن سکیں۔

(ب) اس کے لیے لازم ہے کہ مصنف کے اندر صادق شعور اور خیال بلند موجود ہو۔

(ج) اس صورت میں عبارتوں کی ترتیب و تشکیل اس معنوی نمونہ کے مطابق ہوگی جو ادیب کے دل میں موجود ہے۔

یہ ہیں اسلوب کی خصوصیات اور تفصیلات جو ماہرین اسالیب نے اپنی کتابوں میں جمع کر دی

ہیں۔ (۱)

اسلوب کی تعریف اور اس کی خصوصیات پر اس مختصر گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس کی کیا افادیت و اہمیت ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی زبان کی تفہیم میں اس کے اسلوب کے فہم کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ اس کو سمجھے بغیر ہم اس زبان کی نزاکتوں اور باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسی کو علمائے بلاغت نے علم معانی کا نام دیا ہے۔ ہر کلام متکلم کے جذبات کا آئینہ دار اور اس کی شخصیت کا بھرپور عکاس ہوتا ہے۔ مصنف کے رنج و الم، فرحت و مسرت، غضب و ناراضی، امید و ناامیدی، حسرت و مایوسی، نرمی و شدت اور دوسرے تمام جذبات کا پتا اس کی

(۱) یہ تفصیلات احمد الثائب کی کتاب الاسلوب سے ملخص ہیں۔

تحریروں سے چل جاتا ہے اور یہ سارے نکتے اس کے اسلوب کو سمجھے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔
لیکن ہر زبان کے اسلوب مختلف ہوتے ہیں، ہر قوم کے عقلی و فکری معیار میں تفاوت ہوتا ہے۔ اس لیے اس میدان میں مجرد رائے اور تخمین سے کام نہیں چل سکتا بلکہ ہر زبان کے بولنے والوں کی عادات و خصائل، اسالیب و اطوار سے واقفیت ناگزیر ہے اس کے بغیر کسی زبان کے فہم کا دعویٰ کرنا بے کار ہے۔

موضوع پر اسلاف کی خدمات :

اس موضوع پر ماضی میں علمائے تفسیر و بلاغت نے بڑے قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے اس میدان میں دوسری اقوام کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر عبدالقادر جرجانی کی کتاب دلائل الاعجاز اس موضوع پر قابل فخر کارنامہ ہے۔

قرآن کی عظمت و جلالت اس میں نہیں ہے کہ نحو و بلاغت کے مروجہ اصولوں پر قرآن کے ادب کو پرکھا جائے کیوں کہ اس سے قرآن کی بہت سی چیزیں متاثر ہوں گی۔ پھر بہت سے الفاظ زائد ماننے پڑیں گے، نحو کے بہت سے اصولوں سے انحراف لازم آئے گا اور بلاغت کے بہت سے نکتے قرآن کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ادب و بلاغت کی دنیا میں اجتہاد سے کام لیا جائے اور تقلید کے راستہ کو چھوڑ کر بلاغت کے نئے اصول وضع کیے جائیں جن کی بنیاد قرآن کا بے مثل اور لازوال ادب ہو اور تائید میں امر و القیس اور عمرو بن کلثوم اور قس بن ساعدہ کی نکسالی عربی زبان ہو۔ اگر اس طرز پر کام کیا جائے تو بلاغت کی دنیا میں ایک انقلاب آئے گا اور بہت سے پرانے اصول اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور ہوں گے اور حریری و متنبی کی جگہ دور جاہلیت کا شہ پارہ بنیاد کا کام دے گا اور قرآن کا الہامی ادب اور زیادہ نکھر کر قارئین کے سامنے آسکے گا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ادب اور دین کا تعلق چولی دامن کا ہے۔ ہر نبی نے دعوت فصیح و بلیغ زبان میں دی ہے اور ادب کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھتے ہوئے اس نے اپنی دعوت عوام تک پہنچائی ہے اور اس خاص صفت کی کمی پر اس نے اپنے رب سے بطور خاص دعا فرمائی ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ہی یہ تھا کہ آپ کو جو معجزہ عطا کیا گیا وہ یہی قرآن کا ادب تھا جس نے منکرین حق کو بار بار چیلنج کیا لیکن آج تک کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔ دوسری طرف آپ کا امتیاز یہ

بھی تھا کہ آپ جوامع الکلم سے نوازے گئے تھے۔

قرآن کا اعجاز دراصل اس کے نظم و ترتیب میں پوشیدہ ہے پورا قرآن ایک منظم و مرتب کتاب ہے۔ تفسیر قرآن کی تاریخ بتاتی ہے کہ مفسرین و علماء کا ایک طبقہ اگر نظم کا مخالف رہا ہے تو بہت بڑا طبقہ اس کا حامی رہا ہے اور اس نے اپنی حد تک قرآن میں نظم تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ قرآن کے اسی نظم و ترتیب سے وہ اسلوب وجود میں آتا ہے جو اپنی نوعیت کا منفرد اور یکتا اسلوب ہے۔

ابتداء میں اسلوب کی جو تعریف کی گئی ہے اور اس کی جو خصوصیات ماہرین بلاغت نے بتائی ہیں، انھیں آپ قرآن پر منطبق کر کے دیکھیں تو قرآن کا اعجاز اور زیادہ استحکام کے ساتھ آپ کے سامنے چیلنج بن کر نمودار ہوگا۔

قرآن پاک کی روشنی میں اور جاہلی کلام کی تائید سے انیس اسالیب اس کتاب میں منتخب کیے گئے ہیں، جو یہاں آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔ اگر موقع ملا اور اللہ نے توفیق دی تو اس موضوع پر مزید کام کرنے کا ارادہ اور حوصلہ رکھتا ہوں اس لیے کہ زندگی کا حاصل یہی ہے کہ وہ قرآن کی خدمت میں صرف ہو جائے۔

عبد اللہ فہد فلاحی

ریڈر شعبہ اسلامک اسٹڈیز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲

اسلوب قرآن اور اس کی خصوصیات

اعجاز کلام کے لیے جس طرح رعنائی خیال اور بلندی مضمون ضروری ہے، اسی طرح دل کش اور مؤثر اسلوب اور حسین و جمیل طرز بیان بھی لازمی ہے، بلکہ بسا اوقات بلند اور نادر مضامین بھی بھونڈے اور فرسودہ پیرایہ بیان کی وجہ سے اپنی تاثیر کھودیتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض پامال اور معمولی باتیں بھی اپنی جادو بیانی اور جدت ادا کی وجہ سے معجز نما بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا حمید الدین فراہیؒ کلام کے معجزہ ہونے کے لیے اس میں ہدایت و حکمت کے ساتھ کمال بلاغت، حسن الفاظ اور مؤثر فصاحت کو ضروری قرار دیتے ہیں (۱) قرآن پاک جو عربی ادب کا بے بدل اور لازوال نمونہ ہے، اس کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ بلند معانی اور الہامی تعلیمات کے ساتھ اس نے وہ اسلوب بیان اختیار کیا جس کی نظیر پیش کرنے سے اہل عرب عاجز رہ گئے۔

قرآن سے پہلے عربوں کے یہاں یا تو شعر تھایا پھر نثر میں کاہنوں کے اقوال تھے، جن میں لفظی صنایع نمایاں ہوتی تھی۔ اثر یا تو شعر کا مسلم تھایا جادو کا، معانی کے لحاظ سے کاہنوں کے اقوال بالکل ہی کھوکھلے اور اشعار تدبر سے عاری ہوتے تھے۔ جب قرآن سامنے آیا، تو سب حیران رہ گئے کہ اس کو کس صنف میں داخل کیا جائے، ناقابل انکار تاثیر کا خیال کرتے تو اس کو شعر (۲) یا سحر (۳) کے خانے میں رکھ دیتے، حالاں کہ قرآن کا شعر یا سحر نہ ہونا ایک بدیہی بات تھی۔ نثر کی ظاہری شکل پر نظر جاتی تو قول کاہن کے علاوہ اور کوئی دوسری صنف ہی نہ تھی، اگر کبھی معنی و مطلب کی طرف نظر گئی تو انہیں قرآن میں ”اساطیر الاولین“ کے سوا اور کچھ لحاظ کے قابل نہ ملا۔ دراصل قرآن کی بلندی یہ تھی کہ اس نے پہلی مرتبہ انسان کو غور و فکر پر آمادہ کیا اور اپنی اور کائنات کی حقیقت معلوم کرنے پر ابھارا، پھر اس نے اپنی بات کو پیش کرنے کے لیے جو وسیلہ اختیار کیا، اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ تو بحر ہے نہ وزن اور نہ قوافی کا التزام۔ وہ سجع کے اس بوجھ سے بھی آزاد ہے، جو کاہنوں کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے سادہ اسلوب میں دل میں اتر جانے والی تاثیر رکھتا ہے۔ قرآن کا قالب نثری ہے جو چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہے۔ ایسے جملے کہ ان کو ملا کر پڑھتے وقت وہ نغمہ اور صوت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی نظیر معلوم ہوتے ہیں۔ اس نے نظم و

ترتیب اور اجمال و تفصیل کا وہ بہترین نمونہ پیش کیا کہ اہل عرب دنگ رہ گئے۔ (۴)

دور جدید کے مفسر سید قطب شہیدؒ قرآن کے اعجاز پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قرآن کی جادوگری شریعت کے قوانین، غیب کی خبروں اور علوم کائنات سے ہٹ کر خود اس کی ترتیب و مناسبت اور نظم میں ہے، نہ کہ صرف زیر بحث موضوع میں، یہ الگ بات ہے کہ خود عقیدہ اسلامی کی طبیعت میں قوت اور جاذبیت موجود ہے۔“ (۵)

علامہ عبدالکریم الخطیب بھی اعجاز قرآن کو اس کے اسالیب کے اندر محصور مانتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جو شخص بھی عربی زبان کا سمجھنے والا ہوگا، کلام کی خوب صورتی اور اس کی رعنائی سے واقفیت رکھتا ہوگا وہ قرآن پاک کے معجز نما کلام اور اس کی آیات کی اثر انگیزی کو بخوبی محسوس کرے گا۔ (۶)

علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی نے وجوہ اعجاز کے سلسلے میں ایک قول نقل کیا ہے، جس سے ہماری بات کی بخوبی تائید ہوتی ہے وہ یہ:

إنما عجزوا عن نظم مثل نظمه فإن أنواع كلامهم كانت
منحصرة في الأسجاع والأشعار والأراجيز فجاء نظم التنزيل
على أسلوب بديع لا يشبه شيئا من تلك الأنواع فقصرت أيدى
بلاغتهم عن بلوغ أدنى رتبة من مراتب نظمه۔ (۷)

”اہل عرب قرآن جیسا نظم و ترتیب پیش کرنے سے عاجز رہ گئے، ان کا ادبی ذخیرہ کلام کی تین قسموں تک محدود تھا، مسجع عبارات، اشعار اور رجزیہ قصائد، لیکن قرآن نے نظم و ترتیب کا ایسا منفرد اسلوب پیش کیا جو ان انواع سے ذرا بھی مشابہت نہ رکھتا تھا، چنانچہ ماہرین بلاغت قرآن کے ادنیٰ ترین درجہ نظم تک پہنچنے سے قاصر رہ گئے۔“

خلیفہ عباسی متوکل کا ہم عصر علی بن ربن طبری بھی اسلوب قرآن کو اس کا معجزہ قرار دیتا تھا، اس نے اپنے یہ خیالات اپنی کتاب ”الدین والدولة“ کے صفحہ ۴۰ پر تحریر کیے ہیں وہ کہتا ہے:

”جب میں مسیحی تھا تو اپنے چچا کی طرح میں بھی اس بات کا دعویٰ کرتا تھا کہ قرآن کا

اسلوب معجزہ نہیں ہے، نہ یہ نبوت کی علامتوں میں سے ہے بلکہ یہ تمام انسانوں کے بس

میں ہے، لیکن جب میں نے اس کی تقلید کی کوشش کی اور اس کے کلمات کے مفہوم سے

آشنا ہوا تو اس وقت مجھے پتا چلا کہ قرآن کے پیروکار صحیح دعویٰ کرتے ہیں، اس لیے کہ

۹۵۶۸۷

مجھے نہیں معلوم کہ کتاب اللہ یعنی قرآن جیسی کوئی کتاب ہو جو خیر کا حکم دیتی ہو، برائی سے روکتی ہو، شریعت الہی اور نبوت پر عقیدہ پیدا کرتی ہو، اور جنت کی خواہش اور جہنم کا خوف انسان کے اندر راسخ کر دیتی ہو۔ ہمارے پاس ایک شخص کتاب لاتا ہے، جو انہی خصوصیات کا حامل ہے جب کہ وہ شخص امی ہے، اس نے کبھی کتابت و بلاغت کے فن میں دلچسپی نہیں لی، تو یہ کتاب بلاشبہ اس کی نبوت کی ایک دلیل ہے۔“

اس طرح ابن ربیع طبری کے نزدیک قرآن کا اصلاحی ہدف اور اس ہدف کی تحصیل، اس کے اوامر و نواہی اور جنت و جہنم کی خبریں، اور نبی کے امی ہونے کے باوجود اس کتاب کا دل کش و مؤثر اور دل میں اتر جانے والا اسلوب یہ سب معجزہ ہیں۔ (۸)

علامہ محمد عبدالعظیم الزرقانی نے اسلوب قرآن کی مندرجہ ذیل خصوصیات بیان کی ہیں:

”۱۔ قرآن کا لفظی آہنگ جو اس کے صوتی نظام اور لغوی جمال سے مرکب ہے، یہاں قرآن کے صوتی نظام سے مراد حرکات و سکنات، اتصال و انفصال اور غنائیت و نغمگی میں قرآن کا اتحاد اور اس کی موزونیت ہے۔ اور قرآن کے لغوی جمال سے مراد وہ نادر و عجیب مظہر ہے جس میں قرآن اپنے حروف اور کلمات کی ترتیب میں منفرد و ممتاز ہے اگر آپ قرآن کو اس طرح پڑھیں کہ اس کے حروف مخرج سے نکلیں اور ترتیل کا اہتمام رکھا جائے تو سننے والا ایک خاص قسم کی لذت اور فرحت محسوس کرتا ہے۔“

عجیب بات یہ ہے کہ اس صوتی نظام اور جمال لغوی کی وجہ سے ایک طرف قرآن کا اعجاز نمایاں ہوتا ہے تو دوسری طرف قرآن کو حفظ کرنے میں اس سے سہولت بھی ملتی ہے اور کانوں کو بھلا معلوم ہوتا اور زبان ادائیگی میں ایک نیا مزہ محسوس کرتی ہے۔

۲۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ عوام و خواص دونوں کی تشفی کرتا ہے، دونوں ہی طبقے اس کے جلال کو محسوس کرتے ہیں، اس کی تلاوت کا مزہ چکھتے ہیں اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اس سے اخذ کرتے ہیں جس سے ان کی عقلوں کو اطمینان اور جذبات کو تسکین ہوتی ہے۔

۳۔ یہ اسلوب بیک وقت عقائد اور جذبہ دونوں کے لیے سامان رکھتا ہے، قرآن نے عقل اور قلب کو ایک ساتھ خطاب کیا اور حق اور جمال کو ایک ساتھ ملا دیا ہے۔

۴۔ اس اسلوب کی چوتھی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک طرف احکام و قوانین کی تفصیلات بیان کرتا ہے اور دوسری طرف اپنے اجزاء، کلمات، جملوں اور آیات و سورتوں کو باہم دگر اس طرح مربوط اور منظم کیے ہوئے ہے کہ کوئی دوسرا کلام اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔

۵۔ اس اسلوب کی پانچویں خصوصیت تشریف ہے، یعنی ایک ہی مضمون کو سورنگ سے باندھا جاتا ہے اور ہر رنگ اپنی جگہ نادر اور بے مثال کشش رکھتا ہے، مفہوم ایک ہے لیکن الفاظ مختلف ہیں اور پیش و عقب اور لواحق و تضمینات میں فرق ہے اور ہر جگہ اس کے اطراف و جوانب اور تعلقات و روابط بدلے ہوئے ہیں۔ تاکہ ذہن سلیم رکھنے والا شخص اس کو سمجھ ہی لے۔

۶۔ اس اسلوب نے اجمال اور تفصیل کو ایک ساتھ سمیٹ لیا ہے جب کہ کسی انسانی کلام میں یہ دونوں چیزیں تضاد میں شمار کی جاتی ہیں۔

۷۔ الفاظ بقدر ضرورت ہیں لیکن مفہوم مکمل ہے، قرآن نے انسانی ضرورت کے حساب سے الفاظ اور جملوں کا استعمال کیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ مفہوم سے زائد لفظ کا استعمال ہو گیا ہو یا الفاظ اتنے کم ہوں کہ مخلوق کی ہدایت میں رکاوٹ بن جائیں، اس لفظی احتیاط اور اعتدال کے باوجود معنی بالکل واضح اور صاف ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہے، نہ کوئی ابہام یا تعقید ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

كِتَابٌ اُحْكَمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ۔ (ہود: ۱)

”فرمان ہے، جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے“ (۹)

معلوم ہوا کہ قرآن کی اصل عظمت اور بلندی اس کے منفرد اسلوب اور نادر طرز بیان میں ہے۔ ان اسالیب کا مطالعہ کیے بغیر ہم قرآن کی روح تک نہیں پہنچ سکتے، اس لیے قرآن کے بلند پایہ اور اعلیٰ مقام کو سمجھنے کے لیے اس کے اسالیب کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کتاب میں قرآن کے چند اسالیب سے مختصر بحث کی گئی ہے، تفصیل کے لیے خود قرآن پاک کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

قرآن مبین کے بعض اسالیب

۱- عود علی البدء

یہ قرآن پاک کا ایک اہم اسلوب ہے، یعنی کلام کا آغاز جس چیز سے ہوا ہو اسی پر کلام کا خاتمہ بھی کرنا تاکہ اس مضمون کی اہمیت و افادیت دلوں پر نقش ہو جائے اور سامع اسے فراموش نہ کر سکے، بیچ میں کسی خاص مناسبت اور تقریب سے کچھ مزید چیزیں اور بحثیں بھی آجاتی ہیں جن پر بقدر ضرورت روشنی ڈال دی جاتی ہے، پھر اصل مقصود کی طرف رجوع کر کے پوری گفتگو سمیٹ دی جاتی ہے۔

سورہ مومنوں کی ابتدائی آیات میں مومنین کی صفات گنائی گئی ہیں اور ابتداء نماز سے کی گئی ہے۔ فرمایا گیا:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ۔ (مومنون: ۱-۲)

”یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں“

درمیان میں مختلف صفات کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں پھر اسی صفت کا اعادہ کیا گیا:

وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ (۹)

”اور جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔“

مقصد نماز کو نیکیوں کا منبع اور ان کی محافظ ثابت کرنا ہے، اس امر پر زور دینا ہے کہ نماز ہی سے نیکی کی شروعات ہوتی ہے اور نماز ہی سے ان کی حفاظت بھی ہوتی ہے، اسی مضمون کو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں اس طرح زور دے کر فرمایا ہے:

لَا خَيْرَ فِي دِينٍ بِلَا صَلَاةٍ (۱۰)

یعنی جس دین میں نماز نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔

سورہ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع کا مطالعہ کیجیے جن میں دین کی بنیادی اخلاقیات بیان ہوئی ہیں، ان میں والدین کے حقوق، رشتہ داروں اور مسکینوں کے حقوق، کنجوسی اور فضول خرچی سے اجتناب، قتل اولاد کی ممانعت، زنا، قتل، یتیموں کا مال کھانا، ناپ تول میں کمی کرنا،

زمین میں تکبر اور اکڑنوں کی چال چلنا ان سب سے روکا گیا ہے، لیکن ان سارے امر و نواہی کی ابتدا توحید سے ہوئی ہے اور سب سے پہلے توحید پر زور دیا جاتا اور شرک سے روکا جاتا ہے۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَّخْذُومًا لَّا (بنی اسرائیل: ۲۲)

”تو اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا اور نہ ملامت زدہ اور بے یار و مددگار بیٹھا رہ جائے گا“

اور اس اخلاقی درس کی انتہاء بھی شرک سے اجتناب کی اسی تعلیم پر ہوئی ہے، اس نکلنے کے آخر میں فرمایا جاتا ہے:

وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتُلْقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَّدْحُورًا۔

(بنی اسرائیل: ۲۹)

”اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا بیٹھ ورنہ تو جہنم میں ڈال دیا جائے گا، علامت زدہ

اور راندہ ہو کر“۔

یہاں یہ حقیقت ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ ان تمام بھلائیوں سے وابستگی اور ان تمام حقوق کی ادائیگی توحید سے ممکن ہے، جو شخص توحید کی اس تعلیم پر قائم رہے گا وہی ان تمام حقوق کو ادا کر سکتا اور ان اخلاقیات کا پابند رہ سکتا ہے۔ اسی سے ان فضائل کی ابتداء اور اسی پر ان کی انتہا بھی ہوتی ہے۔

سورہ ممتحنہ کی پہلی ہی آیت میں دشمنوں سے ترک موالات کا حکم دیا گیا ہے، فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ

إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ

الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِنَّكُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا

فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي۔ (ممتحنہ: ۱)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی

کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ،

تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالاں کہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کے

ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں۔ اور ان کی روش یہ ہے کہ رسول کو خود تم کو صرف اس قصور

پر جلا وطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان لائے ہو۔“

آخر میں اسی مضمون پر سورہ کا اختتام کیا گیا ہے، فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوا مِنَ
الْآخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ۔ (ممتحنہ : ۱۳)
”اے لوگو جو ایمان لائے ہو ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے، جو
آخرت سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح کفار قبر والوں سے۔“
گویا اس سورہ کا مرکزی مضمون دشمنوں سے ترک موالات ہے۔

اس اسلوب کی متعدد مثالیں سورہ بقرہ میں بھی موجود ہیں، آیت ۲۰ میں بنی اسرائیل کو خدا
کے احسانات جو ان پر کیے گئے ہیں، یاد دلائے گئے ہیں، پھر آگے آیت ۲۷ میں اسی مضمون کو دہرایا
گیا ہے تاکہ ملامت کے انداز میں یہ دعوت کارگر ثابت ہو اور ان کا جمود ٹوٹ سکے۔
اسی طرح اس سورہ کی آیت ۱۵۲ میں نماز اور صبر سے مدد حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور
پھر اس باب کا خاتمہ اسی حکم پر کیا گیا، اور فرمایا گیا:

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَ قَوْمُوا لِلَّهِ فَنَتِينًا۔
فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم
مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ (سورہ بقرہ: ۲۳۸-۲۳۹)

”اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو، خاص طور سے صلاۃ وسطیٰ کی، اللہ کے آگے اسی طرح
کھڑے ہو جس طرح فرمانبردار غلام کھڑے ہوتے ہیں، بد امنی کی حالت ہو تو خواہ پیدل
ہو خواہ سوار جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو اور جب امن میسر آجائے تو اللہ کو اس طریقے
سے یاد کرو جو اس نے تمہیں سکھا دیا ہے جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔“

یہی اسلوب سورہ معارج میں بھی موجود ہے، فرمایا جا رہا ہے کہ نفس کے متضاد داعیات میں
صحیح توازن اور نقطہ اعتدال پیدا کرنے میں اولین عامل نماز ہے۔ جو شخص اپنی تربیت اس طرز پر کرنا
چاہے کہ شیطان اسے کسی بے راہ روی میں مبتلا نہ کرنے پائے، اس کے لیے سب سے اول شی نماز کا
اہتمام ہے، مختلف صفات کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں پھر نماز کا ذکر فرمایا، وہ آیات یہ ہیں:

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا، إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا و إِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ
مَنُوعًا إِلَّا الْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ قَائِمُونَ۔ وَالَّذِينَ هُمْ
فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِلنَّاسِ وَالْمَحْرُومِ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ

الدِّينِ، وَ الَّذِينَ هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ
 غَيْرُ مَأْمُونٍ، وَ الَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ، إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ
 مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ۔ فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ
 فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ، وَ الَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رَاعُونَ
 وَ الَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَتِهِمْ قَائِمُونَ، وَ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ
 يُحَافِظُونَ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّةٍ مُّكْرَمُونَ (معارج: ۱۹-۳۵)

”انسان بے صبر اپیدا کیا گیا ہے، جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ گھبرا جانے والا ہے، اور
 جب اس کو کشادگی حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے صرف نمازی ہی اس سے مستثنیٰ
 ہیں وہ جو اپنی نمازوں کی مداومت رکھتے ہیں اور وہ جن کے مالوں میں ایک متعین حق ہوتا
 ہے سائلوں اور محروموں کا اور جو تصدیق کرتے ہیں جزا کے دن کی اور وہ جو اپنے رب
 کے عذاب سے ڈرتے رہنے والے ہیں، بے شک ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے
 کی چیز نہیں ہے اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، بجز اپنی بیویوں اور
 لونڈیوں کی حد تک سوا اس باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں، ہاں جس نے اس سے آگے
 بڑھ کر چاہا تو وہی لوگ حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد
 کا پاس رکھنے والے ہیں اور وہ جو اپنی شہادتوں کو ادا کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی نماز کی
 حفاظت کرتے ہیں، یہی لوگ جنتوں میں عزت کے ساتھ رہنے والے ہوں گے۔“

یہاں دیکھیے آیات ۲۲-۲۳ میں نماز ہی سے ان صفات کے بیان کا آغاز ہوا تھا اور اب اسی
 پر اس بات کو ختم کیا ہے، جس سے یہ بات بالبداہت نکلتی ہے کہ تمام ہی نیکیوں کا منبع وہی ہے اور
 وہی ان کی محافظ بھی ہے۔

۲۔ علی سبیل المشاکلہ

عربی ادب کا ایک عام اسلوب یہ ہے کہ کبھی کبھی بعض الفاظ محض مجانست اور صوتی ہم آہنگی کی وجہ سے استعمال ہو جاتے ہیں۔ ان کا مفہوم ان کے لغوی معنی کے لحاظ سے نہیں بلکہ موقع و محل سے متعین ہوتا ہے، مثال کے طور پر حماسی شاعر کہتا ہے:

وَلَمْ يَبْقَ سِوَى الْعُدْوَانِ دِنَاهُمْ كَمَا دَانُوا
(اور ظلم کا بدلہ دینے کے سوا کوئی راہ باقی نہ رہی، ہم نے انہیں بدلہ دیا، جس طرح انہوں نے ہمارے ساتھ سلوک کیا)

یہاں ”کما دانو“ اپنے لغوی مفہوم (انہوں نے بدلہ دیا) میں نہیں بلکہ فَعَلُوا يَظْلَمُوا کے معنی میں مستعمل ہے، اس لیے کہ دشمن نے حملہ میں پہل کی تھی اور اس صورت میں دشمن کے لیے بدلہ دینے کا مفہوم بے معنی ہو جاتا ہے۔

یہ اسلوب قرآن پاک میں بہت مستعمل ہے، سورہ ہود میں فرمایا:
قَالَ إِنْ تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ۔

(ہود: ۳۸)

”نبی نے کہا: اگر تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو ہم بھی کل تم پر ہنسیں گے جس طرح تم آج ہنس رہے ہو۔“

یہاں یہ مراد نہیں ہے کہ ہم بھی اسی طرح تم پر پھبتیاں چست کریں گے جس طرح کہ تم پھبتیاں چست کر رہے ہو، کیوں کہ پھبتی چست کرنے اور مذاق اڑانے کی قرآن میں عام ممانعت کی گئی ہے (۱۱) اور نبی تو اس طرح کی سطحی حرکتوں سے بہت بلند ہوتا ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج جس طرح ہمارا یہ فعل تمہاری نگاہوں میں سامان مضحکہ ہے، اسی طرح کل تمہارا انجام ہمارے لیے موجب از دیاد ایمان و اطمینان ہوگا، آج تم ہنس رہے ہو، کل تم روؤ گے اور ہم نصرت الہی کے ظہور پر مسرور ہوں گے اور اپنے رب کے شکر گزار ہوں گے۔

یہاں فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ (ہم بھی کل تم پر ہنسیں گے) محض صوتی ہم آہنگی کے لیے اور

بر سبیل مشاکلت استعمال ہوا ہے ورنہ کسی کی مصیبت اور رسوائی پر ہنسنا لائق تحسین نہیں ہے۔

اس اسلوب کی دوسری مثال سورہ بقرہ میں ہے فرمایا:

فَإِنْ أَنْتَهُوَ فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ۔ (بقرہ: ۱۹۳)

”اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا کسی پر ظلم جائز نہیں ہے۔“

یہاں لفظ عدوان ظلم و زیادتی کے معنی میں نہ استعمال ہو کر محض اس اقدام کے معنی میں آیا

ہے جو جوابی کارروائی کے طور پر کیا جائے، مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز آکر اسلام کی راہ اختیار لیں تو ان کے پچھلے جرائم کی بناء پر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوگی، صرف انہی کے خلاف کوئی اقدام ہوگا جو اپنے کفر و شرک اور ظلم و عدوان پر جمے رہیں۔

اسی سورہ میں آگے فرمایا:

فَمَنْ اِعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اِعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ۔

(بقرہ: ۹۴)

”پس جو تم پر زیادتی کریں تم بھی ان کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر ان کو جواب دو“

اس آیت میں کسی زیادتی کے جواب میں جو اقدام کیا جائے، اس کو بھی اعتداء کے لفظ سے

تعبیر فرمایا حالانکہ وہ محض اقدام اور جوابی کارروائی کے معنی میں ہے، صرف ماسبق کے ساتھ صوتی ہم آہنگی کی وجہ سے اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔

اس اسلوب کی چوتھی مثال سورہ شوریٰ کی آیت ۴۰ ہے، فرمایا:

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ، إِنَّهُ

لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ۔ (شوری: ۴۰)

”برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ

کے ذمہ ہے، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا“

یہاں کسی برائی کے جواب میں جو اقدام کیا جائے اسے بھی برائی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے،

حالانکہ برائی کا جواب دینا اور انتقام لینا جائز ہے، بشرطیکہ حد سے تجاوز نہ ہو لیکن اسے بھی برائی کہنا

محض لفظی مجانست اور صوتی ہم آہنگی کی وجہ سے ہے، یعنی اہل ایمان کسی برائی کے جواب میں اتنی

ہی کارروائی کرتے ہیں جو برائی کے ہم وزن ہو، ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔

اس طرح قرآن پاک میں مکر، استہزاء اور دوسری ناپسندیدہ صفات و افعال کا خدا کی طرف جو انتساب کیا گیا ہے وہ بھی اسی قبیل سے ہے، مثال کے طور پر ”مکر“ ہے، اگرچہ ایک گروہ نے اسے اچھے معنی میں بھی لیا ہے، اس کے بقول خفیہ تدبیر بعض حالات میں کسی مکر کرنے والے کے مکر کے توڑیا اس کی سزا کے طور پر بھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ خفیہ چالیں چلنے والے کے خلاف اگر کوئی انتقامی کارروائی کی جائے تو وہ اس کو ظلم و زیادتی قرار دے گا اور حالات سے ناواقف اس کو حق بجانب ٹھہرائیں گے، اس طرح کوئی مخفی تدبیر کسی سازشی دشمن کے خلاف بعض اوقات اس کو متنبہ کرنے کے لیے اختیار کرنی پڑتی ہے تاکہ اس پر ظاہر ہو جائے کہ اس کی سازشیں مخفی نہیں ہیں جن کے لیے وہ یہ جال بن رہا ہے وہ اس جال سے واقف ہے۔

لیکن مکر کے معنی ہیں کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے خفیہ تدبیر کرنا اور خفیہ تدبیر کا استعمال وہی کرتا ہے جو کمزور ہو، لیٹ وغیرہ کا یہی خیال ہے کہ مکر خفیہ چال چلنے کو کہتے ہیں، جنگ میں چال چلنا تو جائز ہے لیکن ہر حلال اور جائز کام میں مکر کا استعمال حرام ہے۔ (۱۲)

مکر کے معنی دھوکا دینے اور کسی کو تکلیف دینے کے لیے فریب کاری کے استعمال کے بھی ہیں، کچھ لوگوں نے مکر اور کید کو مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کیا ہے، لیکن بعض لوگ ان دونوں میں تفریق کرتے ہیں اور مکر کو ناجائز اور کید کو جائز کہتے ہیں۔ (۱۳)

کید ہی سے ملتا جلتا لفظ توریت ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہے، چنانچہ احادیث میں جنگ میں کید کے استعمال کو مباح قرار دیا گیا ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کے موقع پر توریت سے کام لیتے تھے۔ (۱۴)

چنانچہ قرآن نے خدا کے لیے ”مکر“ کا استعمال محض مجانست اور صوتی ہم آہنگی کی وجہ سے کیا ہے، مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے:

وَمَكْرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ - (آل عمران: ۵۴)

”اور انھوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ بہترین خفیہ تدبیر

کرنے والا ہے۔“

یہاں اللہ تعالیٰ یہ کہنا چاہتا ہے کہ سیدنا مسیح کے متعلق یہود کے علماء و اکابر نے بڑی سازشیں کیں، انھوں نے اپنے اسلاف کی روایات توڑنے اور بزرگوں کی توہین و تحقیر کا الزام لگایا،

آپ کے پاس اپنے آدمی بھیج بھیج کر ایسے سوالات کیے جن کے جوابات سے آپ کے خلاف کفر و ارتداد کے فتویٰ کا مواد فراہم ہو سکے، آپ کے بارہ شاگردوں میں سے ایک شاگرد یہودا کو جو منافق تھا، رشوت دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ آپ کی مخبری کرے اور آپ کو گرفتار کرادے، لیکن اللہ نے اس کے مقابلے میں یہ تدبیر فرمائی کہ آپ کو نہایت عزت و اکرام کے ساتھ اپنی جانب اٹھالیا اور دشمن جو قتل کے درپے تھے منہ دیکھتے رہے۔

یہاں اللہ کی طرف ”مکر“ کی نسبت اپنے حقیقی مفہوم میں نہ ہو کر بر سبیل مشاکلت استعمال ہوئی ہے۔ (۱۵)

۳۔ نہی کے ساتھ قید

یہ قرآن پاک کا ایک اہم اسلوب ہے جس سے ناواقفیت ایک طالب علم کو بڑی الجھن میں ڈال دیتی ہے۔

نہی کے ساتھ جو قید لگی ہوتی ہے اس کا مقصود صورت حال کا اظہار اور واقعے کے گھناؤنے پن کو نمایاں کرنا ہوتا ہے، قید اس کے ساتھ محض اس لیے بڑھادی جاتی ہے تاکہ وہ صورت حال سامنے آجائے جو اس کے ارتکاب میں مضمر ہے، مثال کے طور پر سورہ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیت کو دیکھیے:

وَ آمِنُوا بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُونُوا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَ
لَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلاً وَ اِيَّايَ فَاتَّقُونِ - (بقرہ: ۴۱)

”اور میں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ، یہ اس کتاب کی تائید میں ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی، لہذا سب سے پہلے تم ہی نہ منکر بن جاؤ اور تھوڑی قیمت پر میری آیات نہ بیچ ڈالو اور میرے ہی غضب سے بچو۔“

اس آیت میں ”وَ لَا تَكُونُوا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ“ کا ٹکڑا قابل غور ہے، یہاں یہ کہنا مقصود نہیں ہے کہ جب دوسرے کفر کر لیں تب تمہارے لیے (اہل کتاب مراد ہیں) کفر کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب قرآن تمہاری کتاب کی تصدیق کرتی ہوئی نازل ہوئی ہے اور اس پر ایمان لانے کا تم سے عہد لیا جا چکا ہے، اس وجہ سے اس کو قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے کی سب سے پہلے تم ہی سے توقع کی جاسکتی تھی لیکن یہ عجیب صورت حال ہے کہ دوسرے تو اس سے نا آشنا ہونے کے باوجود اس پر ایمان لانے میں سبقت کریں اور تم اس سے پہلے سے آشنا ہو کر اس کی مخالفت کی راہ میں پہل کرو۔

اسی طرح ”وَ لَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلاً“ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر اچھے دام مل جائیں تو کتاب الہی کی آیات کا سودا کر سکتے ہو بلکہ نہی کا تعلق یہاں بھی فعل سے ہے۔ یعنی جس چیز سے روکا گیا ہے، وہ دین فروشی ہے لیکن ثمناً قلیلاً کی قید نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ دین فروشی کا یہ کاروبار نہایت ذلیل طریقہ سے ہو رہا ہے کیوں کہ اللہ کی آیات کے بدلے میں اگر تمام

دنیا بھی حاصل ہو جائے تو وہ بہر حال ایک متاع حقیر ہی ہے۔ (۱۶)

اسی سورہ میں آگے صدقہ و انفاق کی ایک حد یہ بتائی گئی ہے کہ یہ ان فقراء اور ضرورت مندوں کے لیے ہے جو کسی دینی مقصد کی خاطر کسب معاش کی جدوجہد سے عاجز ہوں، فرمایا:

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا، وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ۔

(بقرہ: ۲۷۳)

”یہ ان غریبوں کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، زمین میں کاروبار کے لیے نقل و حرکت نہیں کر سکتے بے خبر ان کی خودداری کے سبب ان کو غنی خیال کرتا ہے، تم ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتے ہو وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔“

یہاں ”الحاف“ کے معنی لپٹ کر سوال کرنے کے ہیں، اس ٹکڑے میں اصل مقصود سوال کرنے کی نفی ہے، الحافا کی قید محض سوال کرنے والوں کی عام حالت کے اظہار کے لیے ہے کہ بھلا جو لوگ اتنے خوددار ہیں کہ جو ان کے حال سے بے خبر ہو وہ ان کو غنی سمجھتا ہے، وہ گداگروں اور بھک منگوں کی سی حرکت کس طرح کر سکتے ہیں، چنانچہ ان کی اسی خودداری کی وجہ سے قرآن نے اہل انفاق کو ان کا سراغ دینے کے لیے ان کی پہچان یہ بتائی ہے کہ ان کو صرف چہرے بشرے سے پہچان کر ڈھونڈنے کی کوشش کرو اور ان کے پاس خود پہونچو، یہ توقع نہ رکھو کہ عام گداگروں کی طرح یہ لوگ تمہارے پیچھے پیچھے بھاگیں گے۔

اس اسلوب کی ایک مثال سورہ آل عمران میں بھی ہے، فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً، وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (آل عمران: ۱۳۰)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہ بڑھتا چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔“

یہاں نبی کے ساتھ اضعافا مضاعفا کی جو قید لگی ہوئی ہے، اس سے مقصود یہ نہیں ہے

کہ اسلام میں ممنوع صرف سود در سود ہے، بلکہ یہ قید محض صورت حال کی تصویر اور اس کے گھنوںے پن کے اظہار کے لیے ہے۔ (۱۷)

یعنی یہ کس قدر ذلت اور اخلاق سے گری ہوئی بات ہے کہ جو غریب فقر و فاقہ سے مر رہے ہیں، جن کے بیوی بچے نان جوئیں کو محتاج ہیں، انہیں یہ یہودی و قریشی ساہوکار اور مہاجن لوٹ رہے ہیں اور ان کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں سود در سود قرض دینے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کر رہے ہیں، تو اے ایمان لانے والو، تم اس مکروہ اور پست حرکت سے دور رہو اور اس ناپاک میدان میں اضعا فاً مضاعفۃ کی غلاظت کا انبار جمع کرنے کے بجائے اس جنت کے لیے بازیاں لگاؤ جس کی پہنائی آسمان وزمین کے برابر ہے۔

سورہ نور میں اسی اسلوب کی بلاغت ملاحظہ فرمائیے:

وَلَا تُكْرِهُوا فَتِيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتُغُوا عَرَضَ
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ (نور: ۳۳)

اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دنیوی فائدوں کی خاطر قہر گری پر مجبور نہ کرو جب کہ وہ خود پاک دامن رہنا چاہتی ہوں۔

یہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر لونڈیاں نکاح کی قید میں آنا چاہیں تو ان سے زنا نہ کرو لیکن اگر وہ قید نکاح میں آنے کو تیار نہ ہوں تو ان کو قہر گری پر مجبور کیا جاسکتا ہے بلکہ ”إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا“ (اگر وہ خود پاک دامن رہنا چاہتی ہوں) کی شرط سے مقصود صرف حال کی تصویر اور اس کے نفرت انگیز ہونے کا ذکر ہے۔

جب اسلام نے زنا پر حد جاری کرنے کا حکم دے دیا اور غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کی ہدایت فرمائی (۱۸) تو قدرتی طور پر لونڈیوں کے اندر بھی ایک عام احساس بیدار ہوا کہ وہ اپنے اخلاقی معیار کو اونچا کریں اور ان میں سے جو اپنے مالکوں (۱۹) کے دباؤ کی وجہ سے پیشہ کراتی تھیں وہ خواہش مند ہوئیں کہ یہ حرام پیشہ چھوڑ کر پاک دامنی کی زندگی بسر کریں۔ چنانچہ ان کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے اور چٹکوں کے مالکوں کو تنبیہ فرماتے ہوئے کہا کہ اب ان لڑکیوں کو جب کہ وہ زنا سے توبہ کر کے پاک دامنی کی زندگی اختیار کرنا چاہتی ہیں، بدکاری پر مجبور نہ کرو۔

یہی اسلوب سورہ بنی اسرائیل میں استعمال ہوا ہے، (۲۰) جہاں مفلسی کے ڈر سے اولاد کو

قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے وہاں بھی خَشِيَّةٌ اِمْلَاقِ کی قید محض اس کے گھنوںے پن کو ظاہر کرنے کے لیے ہے، یعنی اپنی اولاد کو قتل کرنے کا کام محض فقر و فاقہ اور مفلسی سے بچنے کے لیے کیا جا رہا ہے جب کہ رازق والدین نہیں بلکہ وہ خدا ہے جو اولاد اور والدین دونوں کو روزی دیتا ہے۔

۴- تشریف

اس لفظ کے معنی گردش دینے اور ہیر پھیر کر بیان کرنے کے ہیں، قرآن پاک کا ایک اہم اسلوب یہ ہے کہ وہ آیتوں کو الٹ پلٹ کر مختلف زاویوں سے بیان کرتا ہے، اس کے لیے اس نے تشریف آیات کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مضمون مختلف سورتوں میں بار بار آتا ہے لیکن ہر جگہ ایک ہی پیش و عقب اور ایک ہی قسم کے لواحق و تضمینات کے ساتھ نہیں آتا بلکہ ہر جگہ اس کے اطراف و جوانب اور اس کے تعلقات و روابط بدلے ہوئے ہوتے ہیں، مقام کے لحاظ سے اس میں مناسب حال تبدیلیاں ہوتی ہیں، ایک ہی چیز کبھی مرکزی مضمون کی حیثیت سے آتی ہے کبھی ضمنی مضمون کی حیثیت سے، کبھی وہی چیز اجمال کے ساتھ آتی ہے کبھی تفصیل کے ساتھ، کبھی ایک چیز مقدم ہوتی ہے کبھی مؤخر، کبھی تنہا ہوتی ہے کبھی اپنے مقابل کے ساتھ، کبھی کسی چیز کے ساتھ اس کا جوڑ ہوتا ہے کبھی کسی چیز کے ساتھ، بالکل یکساں مضمون مختلف پہلوؤں سے جلوہ گر ہو تو اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے اور پوری طرح پہچاننے میں دقت نہ ہوگی، اگر ایک ادانگاہ سے چوک گئی تو دوسرا جلوہ سامنے آجائے گا۔ (۲۱) قرآن پاک نے خود بھی اس تشریف کا مقصد یہی بتایا ہے کہ تاکہ لوگ سمجھ سکیں اور اس کی آیات پر غور کر سکیں، فرمایا:

أَنْظُرْ كَيْفَ نَصَرَفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ - (انعام: ۶۵)

دیکھ کس کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ سکیں۔

اس آیت کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے تشریف کی حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے، کہا یہ جارہا ہے کہ انسان کا حال عجیب ہے کہ جب کسی آفت میں گرفتار ہوتا ہے تو کڑکڑا کر بھی اور دل میں چپکے چپکے بھی خدا ہی کو پکارتا ہے لیکن جب اس سے نجات پا جاتا ہے تو پھر ناشکری و نافرمانی کی وہی زندگی اختیار کر لیتا ہے جس میں پہلے مبتلا تھا یہاں تک کہ اگر خدا کی پکڑ سے اسے ڈرایا جاتا ہے تو ڈھیٹ ہو کر عذاب کا مطالبہ کر بیٹھتا ہے، اس کے بعد فرمایا کہ دیکھو کس طرح ہم اپنی قدرت کی نشانیاں اور اپنے اختیار و تصرف کی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے ہیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ اسے یہ سمجھیں، لیکن یہ سمجھنے کے بجائے ہمارا عذاب ہی دیکھنا چاہتے ہیں، اسی سورہ میں ذرا پہلے اسی بات کو یوں کہا گیا ہے:

أَنْظُرْ كَيْفَ نَصَرَفُ الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ - (انعام: ۴۶)

دیکھ کس کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں، پھر بھی وہ اعتراض کر رہے ہیں۔

قرآن پاک نے تشریف کا لفظ ہواؤں کے لیے بھی استعمال کیا ہے اور ان کے حیرت انگیز اثرات و تصرفات کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے اور فرمایا ہے کہ ہوائیں اپنے رب کے حکم کے مطابق تقسیم امر کرتی ہیں، بعض زمینوں کو جل تھل کر دیتی ہیں بعض کو نیم تشنہ اور بعض کو خشک چھوڑ جاتی ہیں اور اگر حکم الہی ہو تو بعض علاقوں پر وہ سیلاب و طوفان بن کر نازل ہوتی ہیں اور پورے کا پورا علاقہ ان کی لپیٹ میں آکر تباہ ہو جاتا ہے، ٹھیک یہی حال آیات الہی کا ہے یہ آیات کسی کے حق میں مژدہ جانفزا ہوتی ہیں اور کسی کے لیے عذاب کا تازیانہ بن جاتی ہیں۔ (۲۲) سورہٴ مرسلات میں فرمایا:

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا فَالْعَصْفِ عَصْفًا وَالنَّشِرَاتِ نَشْرًا، فَالْفَرْقَتِ فَرْقًا،
فَالْمُلْقِيَةِ ذِكْرًا عُدْرًا أَوْ نُذْرًا إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٍ - (مرسلات: ۱-۷)

شاید ہیں ہوائیں جن کی باگ چھوڑ دی جاتی ہے پس وہ طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور شاہد ہیں ہوائیں پھیلانے والی (بادلوں کو) پھر وہ معاملہ کرتی ہیں جدا جدا، پھر ڈالتی ہیں یاد دہانی اتمام حجت کے طور پر یا آگاہ کر دینے کو، بے شک جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ شدنی ہے۔ (۲۳)

پورے قرآن میں اصلاً تین چیزوں کی دعوت دی گئی ہے اور انہیں مختلف اسلوبوں اور پیرایوں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس سے کلام کی دل کشی اور جاذبیت بڑھ گئی ہے اور کہیں تکرار کا عیب پیدا نہیں ہونے پایا ہے۔

(۱) توحید (۲) معاد (۳) رسالت

قرآن نے انہی تین چیزوں کو مختلف انداز سے بار بار اس طرح دہرایا ہے کہ ہر جگہ یہ مستقل اور نیا مضمون معلوم ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر عقیدہ توحید کو لیجیے، کہیں قرآن نے اسے انسانی فطرت کی پکار کہا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ توحید انسان کے دل کی آواز اور عین تقاضاے فطرت ہے اور شرک اس کے خلاف ہے، (۲۴) کہیں اس پر اس حیثیت سے گفتگو کی ہے کہ یہ تمام انبیاء کی مشترکہ دعوت رہی ہے اور ان سب نے اپنے اپنے زمانے میں توحید ہی کی طرف لوگوں کو بلایا ہے (۲۵) کہیں مشرکین کے اپنے نفس کی شہادت سے استدلال کیا گیا ہے کہ جب کوئی سخت وقت آتا ہے اور انہیں موت یا تباہی سامنے کھڑی نظر آنے لگتی ہے تو وہ اپنے سب بناؤٹی معبودوں کو بھول جاتے ہیں اور صرف اللہ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ (۲۶) کہیں کائنات کے پورے نظام سے توحید کے حق میں زبردست دلائل دیئے گئے ہیں۔ (۲۷) کہیں خدا کے بے شمار احسانات اور اس کی بے پایاں نعمتوں کا تذکرہ کر کے انسانوں کے جذبہ عبودیت کو مہینز کیا گیا ہے۔ (۲۸)

۵- تخلص

اس اسلوب کو اردو شاعری کی اصطلاح میں گریز کہا جاسکتا ہے، یعنی بات میں سے بات پیدا کرنا، ایک مضمون بیان کرتے کرتے بیچ میں کوئی موقع کی ہدایت و نصیحت یا واقعہ بیان کر کے اصل موضوع کی طرف پلٹ آنا، اس کو امام ابن قیم جوزی نے ”تخلص“ یا ”انتقال من فن الی فن“ کہا ہے اور علامہ سیوطی نے، حسن التخلص کہا ہے۔ سیوطی نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

”ایک امر حسن التخلص بھی ہے اور یہ اس بات کا نام ہے کہ متکلم نے جس چیز کے ساتھ کلام کی ابتداء کی ہے، اس سے وہ مقصود اصلی کی طرف نہایت لطیف طریقے پر منتقل ہو جائے اور اس انتقال کے وقت اس قدر دقیق معنی اس کے اندر پیدا کر دے کہ سامع کو انتقال کا پتا ہی نہ چل سکے اور معلوم بھی ہو تو اس وقت جب کہ متکلم امر اول سے امر دوم کی طرف منتقل ہو چکے اور دوسرے کلام کے معنی اس پر منکشف ہو جائیں اور اس کی وجہ یہ ہو کہ ان دونوں امور کے درمیان بڑا ربط اور میل ہوتا ہو، ابوالعلاء محمد بن غانم نے یہ کہہ کر سخت غلطی کی ہے کہ قرآن میں حسن التخلص کی قسم سے کوئی بات نہیں ہے کیوں کہ اس میں تکلف ہوتا ہے اور تکلف فصاحت و بلاغت کے منافی ہے۔“ (۲۹)

سورہ مومنون کا مطالعہ کیجیے، ابتداء اہل ایمان کی فلاح اور حق کی تکذیب کرنے والوں کے خسران کے اعلان سے ہوتی ہے جس میں خدا کی ربوبیت کے شواہد سے جزاء سزا پر استدلال بھی شامل ہے اور پھر یہ سلسلہ آیت ۲۳ و علیہا و علی الفلک ٹحملون (اور ان جانوروں اور کشتیوں پر سواری بھی کرتے ہو) پر ختم ہوتا ہے، آگے مکذبین کے خسران اور مومنین کی فلاح پر تاریخی شواہد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے واقعے کا تذکرہ ہوتا ہے جو تاریخی تقدم کے اعتبار سے بھی رسولوں کی سرگزشت کا سرنامہ ہے اور خاص طور پر کشتی ہی کو ان کی اور ان کے ساتھیوں کی نجات کا اللہ تعالیٰ نے ذریعہ بنایا، کشتی کے ذکر کے بعد اس کشتی والے کے واقعے کا ذکر اس طرح آگیا ہے گویا بات میں سے بات پیدا ہو گئی ہے فرمایا:

وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ وَ لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَى قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ أَفَلَا تَتَّقُونَ۔ (مومنون: ۲۲-۲۳)

اور ان (جانوروں) پر اور کشتیوں پر تم سواری بھی کرتے ہو ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں ہے، کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔

تاریخی شواہد کے بعد آیت ۵۰ سے پھر اصل مضمون شروع ہو گیا ہے۔

سورہ انبیاء آیات ۳۰ تا ۳۳ میں فرمایا: ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیئے جو اس کے توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہیں کہ مبادا وہ ان کے سمیت کسی سمت کو لڑھک کر کسی اور کرہ سے جانکرائے۔ اور یہ اہتمام بھی کیا کہ ان پہاڑوں کے درمیان درّے بھی بنائے کہ وہ لوگوں کے راستے کا کام دیں اور وہ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو آجاسکیں، اگر خدا نے ایسا نہ کیا ہوتا تو لوگ اپنے اپنے علاقوں ہی کے اندر بند ہو کر رہ جاتے اور کسی کے امکان میں بھی نہ ہوتا کہ وہ سفر اور تجارت کی راہیں کھول سکے، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پہاڑوں کے اصل مقصد تخلیق کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ خدا نے اپنی یہ نشانیاں اس لیے نمایاں فرمائیں کہ ان کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھلیں، ان پہاڑوں کے خالق کی قدرت، عظمت اور حکمت کی شان واضح ہو اور وہ خدا تک پہنچ سکیں۔

وَ جَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ وَ جَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا
سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ۔ (انبیاء : ۳۱)

اور ہم نے زمین میں پہاڑ جمادیے تاکہ وہ انہیں لے کر لڑھک نہ جائیں اور اس میں کشادہ راہیں بنادیں تاکہ لوگ (خدا کی طرف) رہنمائی حاصل کر سکیں۔

سورہ ق میں اسی بات کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے:

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَ أَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَ أُنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ
بَهِيْجٍ۔ تَبْصِرَةٌ وَ ذِكْرٌ لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنبِيٍّ۔ (ق : ۷-۸)

اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ لنگر انداز کر دیئے اور اس میں نوع بنوع کی خوش منظر چیزیں اگائیں، ہر متوجہ ہونے والے بندے کے اندر بصیرت اور یاد دہانی پیدا کرنے کے لیے۔

مندرجہ بالا آیت میں انبیاء کے مقصد تخلیق کی طرف اشارہ کر کے اگلی آیت سے پھر اصل مضمون شروع کر دیا گیا اور زمین کی نشانیوں کے بعد آسمان کی نشانیوں پر توجہ دلائی گئی۔

سورہ نحل کی درج ذیل آیات بھی اس اسلوب کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں:

وَ الْأَنْعَامَ خَلَقَهَا۔ لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَ مَنَافِعٌ وَ مِنْهَا تَأْكُلُونَ۔ وَ
لَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَ حِينَ تَسْرَحُونَ وَ تَحْمِلُ

أَنْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بِأَلِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ، إِنَّ رَبَّكُمْ
لَرَوْفٌ رَّحِيمٌ۔ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً۔ وَ
يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ وَ عَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ، وَ مِنْهَا جَائِرٌ وَ لَوْ
شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ۔ (النحل: ۵-۹)

”اس نے جانور پیدا کیے جس میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی اور طرح
طرح کے فائدے بھی، ان میں تمہارے لیے جمال ہے جب کہ تم انہیں چرنے کے لیے
بھیجتے ہو اور جب کہ انہیں شام واپس لاتے ہو، وہ تمہارے لیے بوجھ کو ڈھو کر ایسے
مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے، حقیقت یہ
ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق و مہربان ہے اور اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے
تاکہ تم ان پر سواری کرو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق ہیں اور وہ بہت سی ایسی چیزیں پیدا
کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جب کہ راستے
ٹیرھے بھی موجود ہیں، اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔“

کس خوب صورتی کے ساتھ مقصد تخلیق اور ہدایت و رہنمائی کی طرف بیچ میں اشارہ کر دیا۔

اسی طرح سورہ زخرف کی درج ذیل آیات میں اسی اسلوب کی رعنائی ملاحظہ فرمائیے:
الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ مَهْدًا وَ جَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ
تَهْتَدُونَ، وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَنْشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا
كَذَلِكَ نُخْرِجُونَ وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِنَ
الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ، لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ
رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَ تَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَ مَا
كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ وَ إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ۔ (زخرف: ۱۰-۱۳)

”جس نے تمہارے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنا دیے
تاکہ تم اپنی منزل مقصود کی راہ پاسکو جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور
اس کے ذریعہ مردہ زمین کو جلا اٹھایا، اسی طرح تم ایک روز زمین سے برآمد کیے جاؤ گے،
وہی ہے جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کیے اور جس نے تمہارے لیے جانوروں اور کشتیوں
کو سواری بنایا تاکہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب تم ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو
اور کہو کہ پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انہیں قابو میں
لانے کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔“

یہ آیات تخلص کی بہترین مثال ہیں، لعلکم تہتدون سے اس لطیف اشارے کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ تم اپنے رب کی قدرت و حکمت اور اپنے حال پر اس کی بے پایاں عنایات پر غور کرو اور رب کا شکر بجلاؤ، اس طرح ”إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ“ میں بھی گریز سے کام لے کر دین کی ایک نہایت اہم حقیقت پر روشنی ڈالی ہے، یعنی انسان کو سواری پر بیٹھتے وقت صرف اتنی ہی بات نہیں یاد رکھنی چاہیے کہ ہمیں فلاں شہر سے فلاں شہر کو جانا ہے بلکہ یہ حقیقت بھی یاد رہنی چاہیے کہ ہمیں لازماً اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔

اس اسلوب کی کار فرمائی ہمیں سورہ کہف میں بھی نظر آتی ہے۔ ذوالقرنین نے فرمایا:

هَذَا رَحْمَةٌ مِنْ رَبِّي فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا۔ (الکہف : ۹۸)

یہ میرے رب کا ایک فضل ہے، پس جب میرے رب کے وعدے کا ظہور ہوگا، اس کو ہموار کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ شدنی ہے۔

ذوالقرنین کی اس بات کو کہ جب میرے رب کے وعدہ قیامت کے ظہور کا وقت آئے گا تو یہ ساری بلندیاں پست اور تمام تعمیرات مسمار ہو جائیں گی، اللہ نے وعدہ قیامت کی یاد دہانی اور سرگشتگان دنیا کو تنبیہ کا ذریعہ بنا لیا اور انذار کا وہ مضمون جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا ایک نئے اسلوب سے پھر سامنے آ گیا۔ چنانچہ فرمایا:

وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَ نَفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا وَ عَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِلْكَافِرِينَ عَرْضًا الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَنْ ذِكْرِي وَ كَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا، أ فَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُونِي أَوْلِيَاءَ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا۔ (الکہف : ۹۸-۱۰۲)

”اور اس دن ہم چھوڑ دیں گے وہ ایک دوسرے سے موجوں کی طرح ٹکرائیں گے اور صور پھونکا جائے گا پس ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور اس دن ہم جہنم کو ان کافروں کے روبرو پیش کریں گے جن کی آنکھوں پر ہماری تنبیہ سے پردہ پڑا رہا اور وہ سننے کی تاب نہیں لاتے تھے، کیا ان کافروں نے گمان کیا کہ وہ میرے بندوں کو میرے سوا اپنے لیے کار ساز بنا لیں گے؟ ہم نے کافروں کے لیے جہنم بطور ضیافت تیار کر رکھی ہے۔

اور پھر انذار کا یہ سلسلہ سورہ کے اختتام تک چلا جاتا ہے۔“

۶- تکرار

قرآن کے ایک عام قاری کو اس کے مطالعے کے دوران ایک الجھن یہ محسوس ہوتی ہے کہ اسے اس کتاب میں بظاہر کوئی منطقی ترتیب نظر نہیں آتی، قرآن کے صفحات میں وہ یہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت و نصیحت، عبرت، تنقید و ملامت، تحویف و تبشیر، دلائل و شواہد، تاریخی قصے اور آثار کائنات وغیرہ کی طرف اشارے بار بار ایک دوسرے کے بعد آرہے ہیں اور ایک ہی مضمون کو مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ قرآن کوئی فلسفیانہ کتاب نہیں ہے، نہ وہ اس قسم کا تحقیقی مقالہ ہے جسے ایک ریسرچ اسکالر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے تیار کرتا ہے بلکہ یہ ایک دعوت اور ایک تحریک ہے جس کے مختلف مراحل اور تقاضوں کے مطابق اس کی آیات جستہ جستہ نازل ہوتی چلی گئی ہیں، اور ہر مرحلے کی ضروری ہدایات اور احکام نئے الفاظ، نئے اسلوب اور نئی آن بان سے نازل ہوتے رہے ہیں تاکہ ساری باتیں نہایت خوش گوار طریقے سے دلوں میں بیٹھ جائیں اور دعوت کی ایک ایک منزل اچھی طرح مستحکم ہوتی چلی جائے اور بنیادی عقائد و اصول پہلے قدم سے آخری منزل تک کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائیں بلکہ ان کا اعادہ دعوت کے ہر مرحلے میں ہوتا رہے۔ (۳۰)

جو لوگ قرآن کے اس انداز سے ناواقف ہیں وہ اس کی ادبی نزاکتوں اور معنوی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پاتے اور انہیں قرآن میں بس تکرار ہی تکرار نظر آتی ہے۔ (۳۱) حالاں کہ قرآن تکرار محض سے پاک ہے اور قرآن پر تدبر کرنے والے جانتے ہیں کہ مضامین کی یہ تکرار مختلف پیش و عقب اور لواحق و تضمینات کے ساتھ اس لیے ہوتی ہے تاکہ اس کی بات ہر طالب ہدایت کے ذہن نشین ہو جائے اور منکرین حق کے لیے قیل و قال کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ مثال کے طور پر سورہ قمر کو لیجیے۔ اس میں درج ذیل دو آیات ٹیپ کے بند کے طور پر ہر سرگزشت کے بعد بار بار آتی ہیں:

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَ نُذْرٍ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ
مُدَّكِرٍ۔ (۱۶-۱۷)

پس میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا اور ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے موزوں بنایا ہے تو ہے
کوئی یاد دہانی حاصل کرنے والا۔ (۳۲)

ان آیات کے بار بار وارد ہونے سے کسی کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ یہ تکرار محض
ہے لیکن موقع و محل پر غور کرنے سے یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہر سرگزشت کے
بعد ان آیات کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ مخاطب بیدار ہو جائے، سرگزشت سے نصیحت حاصل
کرے اور قرآن کے مقصد نزول پر اس کی نگاہ جمی رہے۔ اس آیت سے پہلے یہ بات ارشاد ہوئی ہے
کہ پیغمبر جس عذاب سے تمہیں آگاہ کر رہے ہیں، وہ ایک امر شدنی ہے۔ آفاق و انفس سب اس کے
گواہ ہیں رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ اس کی شاہد ہے لیکن تم مچل رہے ہو کہ جب تم اس
عذاب کی نشانی دیکھ لو گے تب مانو گے حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری تعلیم و تذکیر کے لیے قرآن
اتارا ہے جو ہر پہلو سے اس مقصد کے لیے جملہ لوازم سے آراستہ ہے تو تم اس عظیم نعمت سے کیوں
فائدہ نہیں اٹھاتے، عذاب کے تازیانے ہی کے لیے کیوں بے قرار ہو؟ (۳۳)

مثال کے طور پر اس سورہ میں قوم نوح کے عبرت ناک انجام کی تاریخ دہرائی گئی اور جہاں
یہ داستان ختم ہوئی وہیں یہ آیت فٹ کر دی گئی۔ اسی طرح قوم عاد کی تکذیب اور اس کے نتیجے میں
ان کی تباہی پر تبصرہ کیا گیا اور آخر میں بطور ترجیح یہ آیت پھر دہرائی گئی اور جہاں یہ داستان ختم
ہوئی وہیں یہ آیت فٹ کر دی گئی، (۲۱-۲۲) اسی طرح قوم ثمود، قوم لوط وغیرہ کا تذکرہ ہوا ہے اور
اس کے بعد ہی یہ آیت آگئی ہے جو تنبیہ و تذکیر کے لیے نہایت موزوں ہے۔

اسی طرح سورہٴ مرسلات کا مطالعہ کیجیے اس میں مندرجہ ذیل آیت دس بار وارد ہوئی ہے:

وَيَلُّ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ۔ (مرسلات: ۱۵)

(تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی)

یہ خطاب ان ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں سے ہے جو ایک واضح حقیقت کو محض انانیت اور
مکابرت کی وجہ سے جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں ایسے لوگوں کے کان اور آنکھیں کھولنے کے
لیے ضروری تھا کہ صرف دلائل بیان کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ہر دلیل کے بعد بطور تنبیہ ان

کے جرم اور انجام سے ان کو آگاہ بھی کر دیا جائے، اگر مخاطب کے اس مزاج کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جاتی تو جس طرح مریض کے مزاج سے ناواقف معالج کی دوا بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے اسی طرح مخاطب کے مزاج سے ناآشنائی کی وجہ سے نعوذ باللہ کلام خداوندی بھی بے اثر ہو کر رہ جاتا۔

اس سورہ میں ہر دلیل کے بعد اس مختصر ترین جملے کے ذریعہ منکرین آخرت کو زبردست دھمکی دی ہے، اس اختصار و ابہام کے اندر جو ہولناکی مضمر ہے وہ بڑی سے بڑی تفصیل کے اندر بھی نہیں سما سکتی۔ (۳۴)

اس سورہ کی پہلی ترجیع میں فطرت کے عام احوال و معاملات سے استدلال کے لیے ہواؤں کے تصرفات سے استدلال کیا ہے کہ منکرین حق کو اپنی قوت و سطوت پر ناز نہ ہونا چاہیے، اللہ عذاب لانا چاہے تو اسے کوئی بڑا اہتمام نہیں کرنا ہے۔ ہوا جو بارش لاتی ہے اس میں ذرا سے تصرف سے چشم زدن میں انسانی آبادی کا نام و نشان مٹ سکتا ہے، پھر قیامت کی افراتفری کی تصویر پیش کی ہے اور آخر میں ترجیع کے بند کے ذریعے منکرین و مکذبین کو ان کے انجام سے بھی ڈرایا گیا ہے۔

اس کے بعد کلام نے اپنا رخ بدل دیا ہے اور آفاق سے استدلال کرتے ہوئے گزرے ہوئے واقعات، تاریخ کے آثار اور آزمائی ہوئی سنت سے شہادت پیش کی گئی ہے اور پچھلی قوموں کی تباہی اور ہولناکی بیان کر کے ترجیع کی آیت دوبارہ لا کر منکرین حق کو ان کے اپنے انجام سے ڈرا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد نفسی دلیل دی گئی ہے اور انسان کی خلقت کے مختلف مراحل بیان کر کے منکرین کو دعوت فکر دی گئی ہے۔ اس کے بعد وہی آیت ترجیع ہے اور اس کا موع یہ ہے کہ دوبارہ پیدا کیے جانے پر جو شبہات وارد کیے جا رہے ہیں ان کی تردید کے لیے تو خود ان کی خلقت ہی کافی ہے ایک دن وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور وہ جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہی خرابی کا دن ہو گا۔ پھر کائنات سے استدلال کیا گیا ہے اور انسان کی پرورش و پرداخت کے اہتمام کے ذریعے جزا و سزا پر دلیل فراہم کی گئی ہے اور پھر آیت ترجیع ہے اسی طرح پوری سورہ میں ہر جگہ ترجیع کی یہ آیت خاص مفہوم رکھتی ہے۔

اسی طرح سورہ رحمن کو پڑھیے اور درج ذیل آیت کی ترجیع پر غور کیجیے:

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ - (الرحمن : ۱۳)

(تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

یہاں آپ دیکھیں گے کہ اس سورہ کی ایک ایک ترجیح اپنے محل میں اس طرح جڑی ہوئی ہے جس طرح انگشتری میں نگینہ ہوتا ہے۔ یہاں منکرین حق کو ایک نئے اور اچھوتے اسلوب میں یہ سمجھایا ہے کہ یہ اللہ کی رحمانیت ہے کہ اس نے تمہاری تعلیم کے لیے قرآن اتارا۔ تمہاری فطرت کا تقاضا یہ تھا کہ اس پر لبیک کہتے اور عذاب کے ڈنڈے کا انتظار کرنے کے بجائے اس سے ہدایت حاصل کرتے لیکن یہ تمہاری کتنی بد بختی ہے کہ تم اس نعمت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کوئی نئی نشانی دیکھنے کے لیے مچل رہے ہو، اگر کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو آسمان و زمین اور آفاق و انفس کی نشانیوں پر کیوں غور نہیں کرتے جو ہر روز تمہارے مشاہدے میں آتی ہیں اور تمہیں ان حقائق کا درس دیتی ہیں، جن کی دعوت قرآن دے رہا ہے ان نشانیوں کی موجودگی میں کسی نئی نشانی کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے بعد آسمان و زمین کی ایک ایک نشانی پر انگلی رکھ کر توجہ دلائی ہے کہ یہ نشانیاں نہیں ہیں تو کیا ہیں، آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاتے رہو گے۔

مثال کے طور پر اس سورہ کی پہلی ترجیح منعم کی شکر گزاری اور اس کے حقوق کی ادائیگی پر ابھارتی ہے اور جو لوگ تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں، ان کی سرزنش کرتی ہے کہ ہر قدم پر تمہارے سامنے تمہارے رب کی وہ نعمتیں موجود ہیں جو تمہیں مسئولیت کا احساس دلا رہی ہیں لیکن تم انکار کیے جا رہے ہو تو اس کی کن کن عنایتوں کی تکذیب کرو گے؟

دوسری ترجیح (۱۴-۱۶) میں انسانی خلقت کے مختلف مراحل سے جزا و سزا پر استدلال کیا گیا ہے کہ جس طرح اس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا اسی طرح دوبارہ پیدا کرے گا تم اپنی خلقت اول کی تردید اور انکار نہیں کر سکتے۔ اس طرح خلقت ثانی سے انکار کی بھی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

تیسری ترجیح (۱۷-۱۸) میں اللہ کی عظمت و شان کے حوالے سے دلیل فراہم کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ جس اللہ کی عظمت و شان کا یہ حال ہے کہ مشرق و مغرب سب اس کے زیر نگیں ہیں، اگر اس کے انداز کو ہوائی سمجھتے ہو تو آخر اس کی کن کن عظمتوں کا انکار کرو گے؟

چوتھی ترجیح اضمحلال کے توافق کے پہلو سے توحید کی دلیل فراہم کر رہی ہے اور منکرین کو متنبہ کر رہی ہے کہ اگر ان روشن شواہد کے بعد بھی تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے دیوتا اللہ کی پکڑ سے تم کو بچالیں گے تو آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے؟ اسی طرح پوری سورہ میں ترجیح اپنے موقع و محل میں فٹ ہے اور ہر نئی دلیل کے بعد تذکیر و تنبیہ اور سرزنش کر رہی ہے۔

یہی حال سورہ شعراء کا ہے اس میں بطور ترجیح آٹھ باریہ آیات وارد ہوئی ہیں:
 إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَةً وَ مَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ
 الرَّحِيمُ (۸-۹)

اس میں بے شک بہت بڑی نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں
 اور بے شک تمہارا رب غالب بھی ہے اور مہربان بھی۔

یہاں ہر سرگزشت کے بعد ان آیات کے دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ منکرین نبوت کو تنبیہ کی
 جائے اور ہر واقعہ یاد دلا کر یہ حقیقت ان کے ذہنوں میں بٹھادی جائے کہ رسولوں اور ان کے مکذبین
 کی تاریخ اور اس باب میں سنت الہی وہ ہے جو بیان ہوئی اس لیے ان لوگوں کی تقلید کرنے سے بچیں
 جو خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان سرکشوں کو جب چاہے پکڑ سکتا ہے وہ
 عزیز ہے لیکن وہ ان کو توبہ و اصلاح کے لیے مہلت دیتا ہے اس لیے کہ وہ رحیم بھی ہے۔ (۳۵)
 اسی طرح انسان کی ناشکری اور کفران نعمت پر قرآن میں بار بار تعجب اور افسوس کا اظہار کیا
 گیا ہے لیکن ہر جگہ ایک نیا مفہوم، جدا اسلوب اور اچھوتا طرز بیان ہے جو مقصد کی توضیح کے لیے
 نئے نئے گوشوں اور سمتوں کو اجاگر کرتا ہے، مثال کے طور پر سورہ یونس اور سورہ زمر کی دو آیات
 کا تقابل کیجیے اور دیکھیے کہ تکرار کے اسلوب نے کیا کیا جدتیں پیدا کی ہیں اور دونوں میں کسی قدر
 فرق موجود ہے۔

سورہ یونس میں فرمایا:

وَ إِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا
 كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرِّ مَسَّهُ كَذَلِكَ زُيِّنَ
 لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۳)

اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تب تو لیٹے بیٹھے یا کھڑے ہم کو
 پکارتا ہے پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو اس طرح چل دیتا ہے گویا کسی
 تکلیف کے لیے جو اس کو پہنچی، اس نے ہم کو پکارا ہی نہ تھا، اسی طرح حدود سے تجاوز
 کرنے والوں کی نگاہوں میں ان کے اعمال کھبادیئے گئے ہیں۔

یہی مضمون سورہ زمر میں اس طرح بیان ہوا ہے:

و إِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِنْهُ لَنَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ ، وَ جَعَلَ لِلَّهِ أَنْدَادًا لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِهِ۔ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ۔ (۸)

(اور جب انسان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے اس کی طرف متوجہ ہو کر، پھر جب وہ اپنی طرف سے اس کو فضل بخش دیتا ہے تو وہ اس چیز کو بھول جاتا ہے جس کے لیے پہلے پکارتا رہا تھا اور اللہ کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے کہ اس کی راہ سے لوگوں کو گمراہ کرے، کہہ دو اپنے کفر کے ساتھ کچھ دنوں بہرہ مند ہو لو، تم دوزخ والوں میں سے بننے والے ہو)

یہ دونوں آیات ایک ہی مضمون کو بیان کرنے کے لیے وارد ہوئی ہیں اور بظاہر ان میں تکرار ہے لیکن مندرجہ ذیل نکات پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ دونوں میں لفظی و معنوی اعتبار سے کتنا فرق ہے۔

۱۔ سورہ یونس کی مندرجہ بالا آیت اس آیت کے بعد واقع ہوئی ہے:

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللَّهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتَعْجَلَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ۔ (۱۱)

(اگر اللہ لوگوں کے لیے عذاب کے معاملے میں ویسی ہی سبقت کرنے والا ہوتا جس طرح وہ ان کے ساتھ رحمت میں سبقت کرتا ہے تو ان کی مدت تمام کر دی گئی ہوتی) پھر گفتگو کا رخ اس جانب مڑ گیا ہے کہ عذاب کے لیے جلدی مچانے کا معاملہ تو دور کی بات ہے خود مطالبہ عذاب انسان کی طبیعت اور اس کے مزاج کے خلاف ہے کیونکہ جب اسے تکلیف لاحق ہوتی ہے اور وہ پریشانیوں میں گھر جاتا ہے تو اپنے خدا ہی کو پکارتا ہے، اس لیے جو عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں وہ اپنے مطالبے میں صادق نہیں ہیں کیوں کہ یہ ان کی فطرت تخلیق کے خلاف ہے۔

اس کے بالمقابل آخر الذکر آیت کا موقع و محل الگ ہے، یہاں زیر بحث آیت درج ذیل آیت کے بعد وارد ہوئی ہے۔

إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضَى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَإِنْ

تَشْكُرُوا وَيَرْضَاهُ لَكُمْ و لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ
فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ۔ (زمر: ۷)

اگر تم ناشکری کرو گے تو خدا تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری کا رویہ پسند نہیں کرتا اور اگر تم اس کے شکر گزار ہو گے تو اس کو پسند کرے گا اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی پھر تمہارے رب ہی کی طرف تمہاری واپسی ہے تو وہ تمہیں ان کاموں سے آگاہ کرے گا جو تم کرتے رہے ہو، وہ سینوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفر و شرک سے بے نیاز ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے بلکہ تمام مخلوقات اس کی محتاج ہیں اگر ہم اس کے شکر گزار رہیں گے تو وہ اس کو پسند فرمائے گا اور اگر ناشکری کریں گے تو اس کا نتیجہ بھی سامنے آجائے گا۔ انسان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اللہ کے حضور آہ و زاری کرتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس مصیبت کو ٹال دیتا ہے تو وہ مصیبت کو بھول کر اللہ کے بخشے ہوئے فضل میں دوسرے شریکوں کو شامل کر لیتا ہے اس لیے کہ اس کو اللہ پر یقین نہیں ہے، آخرت کی جواب دہی کا احساس ختم ہو چکا ہے اگر آخرت کا خوف ہوتا تو اس کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرتا اور اس کی خدائی میں کسی کو شریک نہ ٹھیراتا۔

۲۔ پہلی آیت میں دَعَانَا کے الفاظ ہیں جب کہ دوسری آیت میں دَعَا رَبِّہ کے کلمات ہیں، یہاں رَبِّہ کے ذریعے یہ معنویت پیدا ہو گئی ہے کہ خود انسان کی فطرت میں اپنے رب کا شعور موجود ہے اور جب وہ غیر اللہ کو شریک کرتا ہے تو گویا اپنی فطرت سے بغاوت کرتا ہے۔

۳۔ پہلی آیت میں انسان سے مراد اس کی جنس ہے یعنی یہ مزاج اور طبیعت ہر انسان کے اندر ودیعت ہے لیکن سورہ زمر میں انسان سے مراد اس جنس کی ایک خاص نوع ہے یعنی کافروں کو مراد لیا گیا ہے۔ کیوں کہ معابِدَ جَعَلَ لِلّٰہِ اُنْدَادًا کا جملہ موجود ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں انسان سے عام انسان مراد نہیں ہے۔

۴۔ سورہ یونس والی آیت میں صرف ”کَشْفِ ضُرِّ“ یعنی تکلیف دور کرنے کا تذکرہ ہے لیکن سورہ زمر کی آیت میں اس سے آگے بڑھ کر ”تَخْوِيلِ نِعْمَتٍ“ یعنی مزید نعمت عطا کرنے کا بیان ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کی ہٹ دھرمی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب ان کی مصیبت دور کر دیتا ہے اور انہیں مزید انعامات سے نوازتا بھی ہے تب بھی ان کو ہوش

نہیں آتا اور شرک پر ان کا اصرار باقی رہتا ہے۔

۵۔ پہلی آیت میں لما کا جواب اس بیان پر مشتمل ہے کہ وہ مصیبتوں سے نکلنے کے بعد پھر دنیوی چلت پھرت اور مادی دوڑ بھاگ میں مشغول ہو جاتا ہے اور اس سنت الہی سے غافل ہو جاتا ہے جو ہر خیر و شر کے پیچھے کار فرما ہوتی ہے۔ لیکن دوسری آیت میں إذا کے جواب میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں، ایک تو تکلیف کو بھول جانا اور دوسرے اپنے رب کو فراموش کر دینا اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیرانا۔

۶۔ پہلی آیت میں صرف اس امر کا تذکرہ ہے کہ یہ شیطان کی تزئین اور ملمع کاری ہے لیکن دوسری آیت میں نہایت واضح آواز میں تہدید ہے، دھمکی دی جا رہی ہے کہ اپنے کفر سے چند روز اور متمتع ہو لو۔ آخر کار تمہیں جہنم کا ایندھن بننا ہے۔ (۳۶)

اس طرح جو چیزیں تکرار محض معلوم ہو رہی تھی وہ بہت سے نئے معانی کی تائیس و تفہیم کا ذریعہ بن گئی ہیں گرچہ دونوں آیات کا بنیادی مفہوم ایک ہے اس طرح قرآن کی تمام آیات جن میں بظاہر تکرار ہے، کا باہم تقابل کیا جاسکتا ہے۔

کیا تکرار کا یہ اسلوب بنی اسرائیل کے لیے خاص تھا؟

بعض علماء و مصنفین نے لکھا ہے کہ تکرار کا یہ اسلوب بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص ہے یا جہاں ان کی داستان بیان ہوئی ہے، وہاں تفصیل، تکرار اور اطباء کی زبان استعمال ہوئی ہے تاکہ زیادہ بہتر طریقے سے تشریح و تفہیم ممکن ہو سکے اور وہ حقائق کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ (۳۷)

مثال کے طور پر اہل مکہ کو خطاب کیا جاتا ہے تو معبودان باطل کی بے وقعتی ظاہر کرنے کے لیے مکھی اور مچھر کی مثالیں دی جاتی ہیں، تشبیہات و استعارات کا بکثرت استعمال ہوتا ہے اور مختصر و جامع الفاظ اور جملوں کے ذریعے مطلب کی ادائیگی ہوتی ہے لیکن بنی اسرائیل کا قصہ چھڑتا ہے تو پوری شرح و بسط کے ساتھ اس کی تمام تفصیلات بیان کی جاتی ہیں اور بار بار ان کا اعادہ ہوتا ہے، (۳۸) لیکن یہ نکتہ پورے قرآن پر منطبق ہوتا دکھائی نہیں دیتا اس لیے کہ اہل عرب کو جہاں خطاب کیا گیا ہے وہاں بھی تفصیل موجود ہے، اصل بات یہ ہے کہ بنیادی عقائد، اصول و تعلیمات اور ارکان ایمان و اسلام پر جہاں گفتگو کی گئی ہے وہاں زیادہ جامع انداز اختیار کیا گیا ہے لیکن جہاں احکام و قوانین کا تذکرہ ہے

وہاں قدرے تفصیل اور وضاحت سے کام لیا گیا ہے، پھر اس حقیقت کو نظر انداز کرنا بھی مشکل ہے کہ خود یہود اشارہ و کنایہ اور شعر و ادب کی زبان بخوبی سمجھتے تھے اور سموئل بن عادیا اور کعب بن اشرف جیسے ممتاز شعراء ان کے یہاں موجود تھے، مزید برآں قرآن اہل عرب اور یہود اور سارے ہی مذاہب کے پیروکاروں کو خطاب کرتا تھا اور ہر قسم کے انسان اس کی آیات سنتے تھے لیکن کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ ہمیں اشاری و رمزاتی زبان چاہیے، یا ہم اطناب و تکرار کے خوگر ہیں۔

جاہلی شعراء اس اسلوب سے مانوس تھے:

نزول قرآن سے پہلے جاہلی ادب میں یہ اسلوب بکثرت استعمال ہوتا تھا، عرب شعراء اس اسلوب سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ اپنے کلام میں حسب ضرورت اس کو جگہ دیتے تھے، مثال کے طور پر عبید بن الابرص الأسدی کہتا ہے:

نحمی حقیقتنا و بعض القوم یسقط بیننا

ہلا سألت جموع کندیة إذ تولوا این اینا (۳۹)

(ہم اپنی حقیقت کی حفاظت کرتے ہیں جب کہ بعض قومیں کمزور اور بزدل ثابت ہوتی

ہیں تم نے کیوں نہیں کندیہ کے فوجیوں سے پوچھا جب کہ وہ پیچھے ہٹ رہے تھے کہ بھگوڑو

کہاں بھاگے جا رہے ہو؟)

یہاں ان دونوں اشعار میں شاعر نے این این اور بین بین کی تکرار کلام میں زور پیدا کرنے

کے لیے استعمال کی ہے۔ اس طرح عوف بن عطیہ بن خزاع الربابی کہتا ہے:

و کادت فزارة تصلی بنا فأولی فزارة أولی فزارا (۴۰)

(قریب تھا کہ فزارہ ہم سے سکون اور ہمدردی حاصل کرتی، افسوس ہے فزارہ پر افسوس

ہے فزارہ پر)

اس طرح مہلہل بن ربیعہ کا وہ مرثیہ پڑھیے جو اس نے اپنے بھائی کلیب کی موت پر کہا ہے،

یہ پہلا قصیدہ ہے جس میں تیس اشعار ہیں اور ترجیع کا بند دس بار استعمال کیا گیا ہے۔

۱- علی أن لیس عدلا من کلیب إذا خاف المغار علی المغیر

۲- علی أن لیس عدلا من کلیب إذا طرد الیتیم عن الجزور

- ۳- علی أن لیس عدلا من کلیب إذا ماضیر جار المستجیر
 ۴- علی أن لیس عدلا من کلیب إذا ضاقت رحیات الصدور
 ۵- علی أن لیس عدلا من کلیب إذا خاف المخوف من الثغور
 ۶- علی أن لیس عدلا من کلیب إذا طالت مقاساة الأمور
 ۷- علی أن لیس عدلا من کلیب إذا هبت ریح الزمهریر
 ۸- علی أن لیس عدلا من کلیب إذا وثب المثار علی المثیر
 ۹- علی أن لیس عدلا من کلیب إذا برزت مخبات الخدور
 ۱۰- علی أن لیس عدلا من کلیب إذا هتف المثوب بالعشیر (۴۱)

ترجمہ:

- ۱- قاتل کا کلیب سے کیا مقابلہ ہو سکتا تھا جب کہ لوگ حملہ آور سے خوف کھانے لگتے تھے!
 - ۲- قاتل کلیب کا کوئی ہمسرنہ تھا جب کہ یتیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جاتا تھا!
 - ۳- کلیب کا کوئی مد مقابل نہ تھا جب کہ پناہ کے طالب کے پڑوسی پر ظلم کیا جاتا تھا۔
 - ۴- کلیب کی کوئی نظیر نہ تھی جب کہ سینوں کی کشادگیاں تنگیوں میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔
 - ۵- کلیب کا کوئی حریف نہ تھا جب کہ بزدل سرحدوں سے خوف کھانے لگتے تھے۔
 - ۶- کلیب کا حریف بننا ممکن نہ تھا جب کہ سخت معاملات دراز ہو جاتے تھے۔
 - ۷- کلیب کا کوئی مثل نہ تھا جب کہ سخت ٹھنڈک کی ہوائیں چلنے لگتی تھیں۔
 - ۸- کلیب کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا جب کہ مخاطب ابھارنے والے پر حملہ کر بیٹھتا تھا۔
 - ۹- کلیب کا مقابلہ کرنا مشکل تھا جب کہ پردہ نشینوں کے پردے اٹھ جاتے تھے۔
 - ۱۰- کلیب سے کوئی بازی نہ لے جاسکتا تھا جب کہ فریادرس احباب و اقارب سے فریاد طلب کرتا تھا۔
- اسی طرح حارث بن عباد کا وہ قصیدہ بھی ملاحظہ فرمائیے جو اس نے اپنی قوم کو جنگ پر ابھارتے ہوئے کہا تھا، اس قصیدہ میں اس نے ”قربا مربط النعامة منی“ کی تکرار چودہ بار کی ہے اور ابن بدرون کے بقول پچاس سے زائد بار اس ٹکڑے کو اس نے استعمال کیا ہے:
- ۱- قربا مربط النعامة منی لفتح حرب وائل عن حیال

- ۲- قَرَّبَا مَرَبَطَ النِّعَامَةَ مَنِي
 ۳- قَرَّبَا مَرَبَطَ النِّعَامَةَ مَنِي
 ۴- قَرَّبَا مَرَبَطَ النِّعَامَةَ مَنِي
 ۵- قَرَّبَا مَرَبَطَ النِّعَامَةَ مَنِي
 ۶- قَرَّبَا مَرَبَطَ النِّعَامَةَ مَنِي
 ۷- قَرَّبَا مَرَبَطَ النِّعَامَةَ مَنِي
 ۸- قَرَّبَا مَرَبَطَ النِّعَامَةَ مَنِي
 ۹- قَرَّبَا مَرَبَطَ النِّعَامَةَ مَنِي
 ۱۰- قَرَّبَا مَرَبَطَ النِّعَامَةَ مَنِي
 ۱۱- قَرَّبَا مَرَبَطَ النِّعَامَةَ مَنِي
 ۱۲- قَرَّبَا مَرَبَطَ النِّعَامَةَ مَنِي
 ۱۳- قَرَّبَا مَرَبَطَ النِّعَامَةَ مَنِي
 ۱۴- قَرَّبَا مَرَبَطَ النِّعَامَةَ مَنِي
- ليس قولی یراد و لكن فعالی
 جدّ نوح النساء بالأعوال
 شاب رأسی و أنكرتنی القوالی
 للسری و الغدوّ والآصال
 طال لیلی علی اللیالی الطوال
 لاعتناق الأبطال بالأبطال
 و أعدلا عن مقالة الجهال
 ليس قلبی عن القتال بسال
 كلما هبت ریح ذیل الشمال
 لبجیر مفلک الأغلال
 لكريم متوح بالجمال
 لا نبیغ الرجال بیع النعال
 لبجیر فداہ عمی و نحالی (۴۲)

ترجمہ:

- ۱- نعامہ (شاعر کے گھوڑے کا نام) کو میرے قریب لاؤ کہ وائل کی جنگ طلب مبارزت سے پھر بھڑک اٹھی ہے۔
- ۲- نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، میرے قول کو نہیں بلکہ میرے فعل کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔
- ۳- نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، کہ عورتوں کا نوحہ و ماتم اور ان کی چیخ و پکار بہت ہو چکی۔
- ۴- نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، میرے سر پر بڑھاپا طاری ہو چکا ہے اور نفرت کرنے والی عورتیں مجھے اجنبی سمجھنے لگی ہیں۔
- ۵- نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، کہ صبح و شام اور راتوں کو سفر کرنا ہے۔
- ۶- نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، کہ لمبی راتوں سے بھی میری رات لمبی ہو چکی ہے۔
- ۷- نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، سو رہا ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوں۔

- ۸- نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ اور جاہلوں کی باتوں سے صرف نظر کرو۔
- ۹- نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، میرا دل جنگ کے بغیر قابو نہ پاسکے گا۔
- ۱۰- نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، جب جب شمال کے اطراف کی ہوا چلے۔
- ۱۱- نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، بحیر (مقتول بیٹے کا نام) کی خاطر جو بیڑیوں کو کھولنے والا تھا۔
- ۱۲- نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ اس شریف کی خاطر جو حسن و جمال کے تاج سے آراستہ تھا۔
- ۱۳- نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ، ہم جو توں کی طرح آدمیوں کو فروخت نہیں کرتے۔
- ۱۴- نعامہ کو مجھ سے قریب لاؤ بحیر کی خاطر، اس پر میرے چچا اور میرے ماموں قربان ہوں۔ (۴۳)
- صاحب معلقہ عمرو بن کلثوم بادشاہ حیرہ کو دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے:

بأی مشیئة عمرو بن هند نكون لقلکم فیہا قطينا
 بأی مشیئة عمرو بن هند تری أنا نكون الأردلینا
 بأی مشیئة عمرو بن هند تطیع بنا الوشاة و تذرینا (۴۴)

(اے عمرو بن ہند! کس اقتدار کے بل بوتے پر تم چاہتے ہو کہ ہم تمہارے سرداروں کے غلام بنیں؟

اے عمرو بن ہند! کس اقتدار کے بل بوتے پر تم سمجھتے ہو کہ ہم ذلیل ہیں؟۔
 اے عمرو بن ہند! کس اقتدار کے بل بوتے پر تم ہم سے چاکری کرانا چاہتے ہو اور ہمیں حقیر سمجھتے ہو؟)

اس اسلوب کے بعض فوائد:

قرآن نے اس اسلوب کو مختلف مواقع پر مختلف فوائد کے پیش نظر استعمال کیا ہے، جن میں سے چند ایک کی نشاندہی یہاں کی جاتی ہے:

۱- طول فصل کی وجہ سے جب کوئی لفظ یا مضمون ذہنوں سے او جھل ہونے لگے تو اسے ذہن میں بٹھانے کے لیے دوبارہ ذکر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل آیات کا مطالعہ کیجیے:

فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلُقُومَ وَأَنْتُمْ حِينِيذٍ تَنْظُرُونَ وَ نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ
 مِنْكُمْ وَلَكِنْ لَا تُبْصِرُونَ فَلَوْلَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ تَرْجِعُونَهَا إِنْ

كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ (واقعة : ۸۳-۸۴)

اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنے اس خیال میں سچے ہو تو جب مرنے والوں کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے ہو اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس سے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے۔

ان آیات میں اعتراض کی وجہ سے تسلسل ٹوٹا نظر آ رہا تھا اس لیے اسے سلسلہ کلام سے مربوط رکھنے کے لیے لولا کی تکرار ہو گئی۔

لفظی تکرار کی دوسری مثال سورہ مائدہ میں بھی ہے، سورہ مائدہ کی یہ آیت بطور خاص

ملاحظہ کیجیے:

فِيمَا نَقَضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ وَ كُفِّرِهِمْ بآيَاتِ اللَّهِ وَ قَتَلِهِمُ الْآبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَ قَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا وَ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا۔ (المائدہ: ۱۵۵، ۱۵۶)

آخر کار ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں، حالاں کہ درحقیقت ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اس وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔ پھر یہ اپنے کفر میں اتنے بڑھے کہ مریم پر سخت بہتان لگایا۔ اس طرح اللہ کا یہ قول بھی ملاحظہ فرمائیے:

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَ أَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ۔ (نحل : ۱۱۹)

البتہ جن لوگوں نے جہالت کی بنا پر برا عمل کیا اور پھر توبہ کر کے اپنے عمل کی اصلاح کر لی تو یقیناً توبہ و اصلاح کے بعد تیرا رب ان کے لیے غفور اور رحیم ہے۔

اس آیت میں طول فصل کی وجہ سے مفہوم منتشر ہوتا نظر آ رہا تھا چنانچہ پھر ”اِنَّ رَبَّكَ“ کے ذریعے کلام کو مربوط کر دیا۔

سورہ یوسف کی یہ آیت بھی اس اسلوب کی عمدہ مثال ہے:

إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَى عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي
سَاجِدِينَ۔ (۴)

میں نے گیارہ ستاروں کو دیکھا اور چاند و سورج کو میں نے دیکھا کہ وہ مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں۔

اس آیت میں بھی ”رَأَيْتُهُمْ“ کی تکرار آغاز کلام سے اتصال قائم کرنے کے لیے ہے۔

۲۔ انذار و تبشیر کے موقعوں پر بھی تکرار کا یہ اسلوب مستعمل ہے تاکہ سامعین کے دلوں

میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جائے اور وہ اس کا خاطر خواہ اثر لے سکیں۔ قرآن کا یہ انداز انذار ملاحظہ کیجیے:

أَأَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمْ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ۔
أَأَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا۔ فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ
نَذِيرُ۔ (ملک: ۱۶-۱۷)

کیا تم اس سے بے خوف ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے اور یکایک
یہ زمین جھکولے کھانے لگے، کیا تم اس سے بے خوف ہو جو آسمان میں ہے کہ تم پر پتھر او
کرنے والی ہوا بھیج دے پھر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ میری تنبیہ کیسی ہوتی ہے۔

اس سورہ میں آگے اللہ تعالیٰ یوں دھمکی دیتا ہے:

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكْنِي اللَّهُ وَ مَنْ مَعِيَ أَوْ رَحِمْنَا فَمَنْ يُجِيرُ
الْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ۔ (۲۸)

ان سے کہو کبھی انہوں نے سوچا کہ اللہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو خواہ ہلاک کر دے یا ہم
پر رحم کرے کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچالے گا؟

ایک ہی آیت کے بعد پھر کہتا ہے:

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاءُكُمْ غُورًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَعِينٍ۔ (ملک: ۳۰)

ان سے کہو کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمہارے کنویں کا پانی زمین میں اتر جائے تو کون
ہے جو اس پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمہارے لیے نکال کر دے دے گا؟

قرآن کی مندرجہ ذیل آیات بھی پڑھیے اور تکرار کے اس اسلوب پر غور کیجیے:

أَفَمِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا وَ هُمْ نَائِمُونَ أَوْ أَمِنْ أَهْلِ
الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضُحًى وَ هُمْ يَلْعَبُونَ، أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ فَلَا

يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمَ الْخَاسِرُونَ - (اعراف : ۹۷-۹۹)
 پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک
 ان پر رات کے وقت نہ آجائے گی جب کہ وہ سوئے پڑے ہوں؟ یا انہیں اطمینان ہو گیا
 ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکایک ان پر دن کے وقت نہ پڑے گا جب کہ وہ کھیل رہے
 ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالاں کہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے
 خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔

ان تمام آیات میں بالترتیب اُمنتُم من فی السماء، قل أرايتم، أو أمن أهل القرى کی
 تکرار انداز میں زور پیدا کرنے کے لیے ہے۔ کیا ان آیات کو سن کر منکرین حق پر لرزہ نہ طاری ہو گیا ہوگا؟
 ۳۔ تکرار کا یہ اسلوب تاکید کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً کسی حماسی شاعر کا کہنا ہے:
 إلى معدنه العز المؤئل والندي هناك هناك الفضل والخلق الجزل (۴۵)
 (چلو عزت و اقتدار کے مرکز کی طرف جو بہت عظیم ہے، سر اپا سخاوت ہے اخلاق کریمہ
 اور فضیلت کی مہک وہیں میسر آئے گی۔)

قرآن کہتا ہے:

فَلَمَّا أَرَادَ أَنْ يَبْطِشَ بِالَّذِي هُوَ عَدُوٌّ لَهُمَا - قَالَ يَا مُوسَى أَتُرِيدُ أَنْ
 تَقْتُلَنِي كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْأَمْسِ، إِنْ تُرِيدُ إِلَّا أَنْ تَكُونَ جَبَّارًا فِي
 الْأَرْضِ وَ مَا تُرِيدُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْمُصْلِحِينَ - (قصص: ۱۹)
 پھر جب موسیٰ نے ارادہ کیا کہ دشمن قوم کے آدمی پر حملہ کرے تو وہ پکار اٹھا، اے موسیٰ!
 کیا آج تو مجھے اسی طرح قتل کرنے لگا ہے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے؟ تو
 اس ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتا ہے، اصلاح کرنا نہیں چاہتا۔

ان جملوں میں تُرِيدُ کا بار بار استعمال تاکید پیدا کرنے کے لیے ہے، ایک دوسری جگہ قرآن کہتا ہے:
 قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ وَ أُمِرْتُ لِأَنْ أَنْ
 أَكُونَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ - (زمر: ۱۱، ۱۲)

اے نبی! ان سے کہو! مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی
 کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مسلم بنوں۔

اس آیت میں بھی اُمُوٹ کی تکرار زور اور تاکید پیدا کرنے کے لیے ہے، سورہ مدثر کا مطالعہ کیجیے۔ ایک منکر خدا اور سول کی پینترے بازیوں کے جواب میں کس طرح اس کی ہلاکت و بربادی کا اعلان کیا جا رہا ہے:

فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرْتُمْ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ - (مدثر: ۱۹، ۲۰)

خدا کی مار اس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی خدا کی مار اس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔
سورہ انشراح میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا - (۶، ۵)

بیشک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بیشک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔

ایک ہی بات کو دوبارہ دہرایا گیا تاکہ آنحضورؐ اور آپ کے صحابہ کو پوری طرح تسلی ہو جائے کہ جن حالات سے اس وقت اسلام گذر رہا ہے وہ دیرپا نہیں ہیں بلکہ ان کے بالکل قریب ہی اچھے حالات آنے والے ہیں۔

سورہ کافرون کو دیکھیے پہلے فرمایا کہ ”اے کافرو! نہ میں پوجتا ہوں جسے تم لوگ پوجتے ہو اور نہ تم پوجتے ہو جسے میں پوجتا ہوں۔“ پھر اسی مضمون کا اعادہ اگلی چوتھی اور پانچویں آیات میں کیا گیا:

وَأَنَا عِبْدٌ مَّا عَبَدْتُمْ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَّا أَعْبُدُ - (کافرون: ۴، ۵)

اور نہ میں پوجنے کا جسے تم لوگ پوجتے آئے اور نہ تم لوگ پوجنے کے جسے میں پوجتا ہوں۔

بلاغت کا تقاضہ تھا کہ یہ اعلان برأت نہایت واضح اور موکد لفظوں میں کیا جاتا اور یہ بلاغت قرآن کی خصوصیت ہے کہ کہیں اس میں بے فائدہ تکرار نہیں پائی جاتی، وہ ہر تکرار کے ساتھ کسی جدید فائدہ کا اضافہ ضرور کر دیتا ہے، یہ لفظ عابدون مستقبل کی تمام امیدوں کا خاتمہ کر رہا ہے اور عبادتہم میں ان کے دین آبائی سے بیزاری کا اعلان ہے اور مقابلتہ اس میں زیادہ شدت اور نفرت کا اظہار ہے، (۴۶) اس کی مثال سورہ انبیاء میں بھی موجود ہے۔ (۴۷)

۴۔ تکرار کا یہ اسلوب عاجزی اور مسکنت کے اظہار اور کسی بڑے کے سامنے اپنی درخواست پیش کرنے کے موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ بقرہ کا آخری حصہ ملاحظہ ہو:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَانَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ

عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ - (البقرہ: ۲۸۶)

اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائے، ان پر گرفت نہ کر، مالک ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے، پروردگار جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ!

اس آیت میں ربنا کی بار بار تکرار اپنی عاجزی کے اظہار اور درخواست کو عجز و مسکنت کا مجموعہ بنا کر پیش کرنے کے لیے ہے اور اس موقع کے لیے یہی اسلوب موزوں اور موثر ہے۔
حضرت ابراہیمؑ کی دعا ملاحظہ ہو:

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ، رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً
لِّلَّذِينَ كَفَرُوا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ (ممتحنہ : ۴)
اے ہمارے رب تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کر لیا
اور تیرے ہی حضور ہمیں پلٹنا ہے اور اے ہمارے رب ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا دے،
اے ہمارے رب ہمارے قصوروں سے درگزر فرما بے شک تو ہی زبردست اور دانا ہے۔

۵۔ تکرار کا ایک فائدہ حسرت و افسوس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ مثلاً حسین بن خنجر معن

بن زائدہ کا مرثیہ کہتا ہے:

فِيَا قَبْرَ مَعْنٍ أَنْتَ أَوَّلُ حُفْرَةٍ مِنْ الْأَرْضِ حُطَّتْ لِلْسَّمَاحَةِ مَوْضِعًا
وَا يَا قَبْرَ مَعْنٍ كَيْفَ وَا رَيْتَ جُودَهُ وَ قَدْ كَانَ مِنْهُ الْبَرُّ وَالْبَحْرُ مَتْرَعًا (۴۸)
(اے معن کی قبر تو اس روئے زمین کی اولین قبر ہے جس میں سخاوت و شرافت دفن
کردی گئی ہے، اے معن کی قبر، تو نے اس کی سخاوت کو کیسے چھپا لیا جب کہ بحر و براس سے
بھرے پڑے ہیں!)

ایک اعرابیہ اپنے بچے کا مرثیہ یوں کہتی ہے:

يَا مَنْ أَحَسَّ بَنِي اللَّذِينَ هُمَا كَالذَّرْتَيْنِ تَشَطَّى عَنْهُمَا الصَّدْفُ
يَا مَنْ أَحَسَّ بَنِي اللَّذِينَ هُمَا سَمِعِي وَطَرْفِي فَطَرْفِي الْيَوْمَ مُخْتَطَفُ (۴۹)
(ہائے کس نے دیکھا میرے ان دونوں بیٹوں کو جو موتیوں کی مانند تھے جن سے صدف
ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ہائے کس نے دیکھا میرے ان دونوں بیٹوں کو جو میرے کان اور
میری بینائی تھے، آج میری بینائی چھین گئی ہے)

ان دونوں ٹکڑوں میں یا قبر معن اور یا من أحسن بنی اللدین ہما کی تکرار درد و غم میں زور پیدا کرنے کے لیے ہے۔ سورہ قیامہ میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

أُولَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ ثُمَّ أُولَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ
سُدَىٰ۔ (قیامہ : ۳۴-۳۶)

یہ روش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھ ہی کو زیب دیتی ہے۔ ہاں یہ روش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے، کیا انسان نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟

قصوں کی تکرار:

بلاشبہ قرآن پاک میں پچھلے انبیاء اور ان کی قوموں کی جو سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں اہل عقل کے لیے بڑا سامان عبرت موجود ہے بشرطیکہ وہ عقل سے کام لیں اور ان سرگزشتوں کو دوسروں کی حکایت اور داستان سمجھ کر نہ سنیں بلکہ ان سے خود اپنی زندگی کو درست کرنے کے لیے سبق حاصل کریں چنانچہ قرآن خود صراحت کرتا ہے کہ یہ کتاب اپنے آغاز کے اعتبار سے ہدایت اور انجام کے اعتبار سے رحمت ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولَى الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَى
وَ لَكِنْ تَصَدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَ هُدًى وَ
رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (یوسف: ۱۱۱)

ان انبیاء کی سرگزشتوں میں اہل عقل کے لیے بڑا سامان عبرت ہے، یہ کوئی گھڑی ہوئی چیز نہیں ہے بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے اور تفصیل ہے ہر چیز کی اور ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔ (۵۰)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ واقعات اور قصے قرآن پاک میں ایک سے زیادہ جگہوں پر مکرر کیوں بیان ہوئے ہیں؟ کیا ان کا مقصد محض تذکیر و یاد دہانی ہے، (۵۱) یا ان میں گونا گوں حکمتیں موجود ہیں، علماء نے اس تکرار کے متعدد فوائد گناے ہیں مثال کے طور پر:

۱۔ اس تکرار سے قرآن کی اعلیٰ درجہ کی بلاغت اور انسانی طاقت سے ماوراء فصاحت کا

اظہار ہوتا ہے، قرآن میں جہاں کہیں کسی قصے کی تکرار ہوتی ہے، اسلوب بدلا ہوا ہے الفاظ مختلف ہیں، سیاق و سباق جدا ہیں اور قصہ کے صرف انہی پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے جو اس مقام پر ضروری محسوس ہوئے ہیں بقیہ اجزاء سے یا تو صرف نظر کیا گیا ہے یا سرسری طور پر ان کا تذکرہ ہو گیا ہے، اس سے قرآن پاک کا اعجاز کھل کر سامنے آجاتا ہے، جو قرآنی ادب کے مقاصد میں تو نہیں لیکن اس کے لوازم میں ضرور شامل ہے۔

۲۔ اس تکرار سے جن معانی کو ذہن نشین کرنا مقصود ہوتا ہے وہ اچھی طرح ذہن و دماغ میں رچ بس جاتے ہیں کیوں کہ تکرار سے تاکید و توضیح کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ (۵۲)

۳۔ قصوں کی بار بار تکرار سے سارے انبیاء کی مکمل داستان محفوظ ہو گئی، اگر تکرار نہ ہوتی تو قصوں کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا، مثال کے طور پر حضرت موسیٰ کی داستان ایک قوم کے پاس محفوظ ہوتی اور عیسیٰ کی داستان کسی اور کے پاس ہوتی، اس طرح سارے قصے منتشر ہو جاتے۔

۴۔ انبیاء کے ان قصوں کا بار بار اعادہ کر کے نبی اکرم کو تسلی دی گئی اور مصائب و آلام کے ماحول میں آپ کی تثبیت قلب کا سامان کیا گیا، چنانچہ قرآن خود کہتا ہے کہ یہ سرگزشتیں ہم اس لیے سناتے ہیں کہ ان کے وہ پہلو ہم تمہارے سامنے لائیں جو تمہارے دل کو مضبوط کریں تاکہ ان حالات کا پامردی اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کر سکو جو تمہیں پیش آئے ہیں یا آئندہ پیش آسکتے ہیں۔ فرمایا:

و كَلَّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُنَبِّئُ بِهِ فُؤَادَكَ۔ (ہود: ۱۲)

اور ہم رسولوں کی سرگزشتوں میں سے ہر ایک تمہیں سنارہے ہیں جن سے تمہارے دل

کو تقویت دیں۔ (۵۳)

تکرار کی اصل حکمت:

لیکن درج بالا فوائد اور حکمتیں عام ہیں اور بظاہر ان میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی، جن لوگوں نے قرآن پاک کا نظم کلام کی روشنی میں مطالعہ کیا ہے اور ایک ہی قصہ کو اس کے مختلف مقامات کے تقابل کے ساتھ دیکھا ہے وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں کہ اگر کسی مقام پر واقعے کے ایک پہلو کو نمایاں کر کے بیان کیا گیا ہے تو دوسرے مقام پر اس کے کسی دوسرے پہلو

کو۔ گویا سابقہ آیات کے سیاق و سباق میں واقعے کے کسی خاص پہلو پر زور دینا مقصود ہوتا ہے۔ کیوں کہ جس طرح ایک دلیل مختلف دعویٰوں پر اثر کرتی ہے، اسی طرح ایک قصے سے مختلف نتائج مستنبط ہوتے ہیں اور متعدد موقعوں پر ان سے استشہاد کیا جاتا ہے، اس لیے ان قصوں کے اعادہ سے مختلف نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ (۵۴)

قصہ آدم و ابلیس:

مثال کے طور پر قصہ آدم و ابلیس کا مطالعہ کیجیے۔ یہ قرآن میں سات مقام پر بیان ہوا ہے لیکن ہر جگہ پس منظر، مقصد تکرار اور لواحق و تضمینات بدلے ہوئے ہیں اور ہر مقام پر واقعہ کے اس خاص پہلو پر زور دینا مقصود ہے جو دوسری جگہ پر مقصود نہیں ہے۔

مثال کے طور پر سورہ بقرہ کو لیجیے، آیت ۳۰ سے ۳۹ تک دس آیات میں یہ قصہ بیان ہوا ہے، اس سے پہلے ان لوگوں کا حال بیان ہوا ہے جو اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور ان لوگوں کا بھی جو ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ اعراض و استکبار، تعصب و ہٹ دھرمی اور عناد و مخالفت کی راہ اپنائیں گے۔ خاص طور سے یہودیوں کو متنبہ کیا گیا ہے اور ان کی چالوں سے بنی اسمعیل کو ہوشیار کیا گیا ہے اور اس کے بعد آگے کی دس آیات میں آدم کی خلافت اور شیطان کی مخالفت کی سرگزشت ہے جو اپنے اندر گونا گوں حکمتیں رکھتی ہے:

۱۔ یہ سرگزشت ایک آئینہ ہے جس میں اس تمام موافقت اور مخالفت کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی، فرشتوں کا سوال کرنا اور جواب پا کر مطمئن ہو جانا ان لوگوں کی مثال ہے جو آغاز دعوت میں اسلام کے مخالف یا متردد تھے لیکن شکوک و شبہات کے بادل جیسے چھٹے وہ تحریک اسلامی کے ہر اول دستے کے سپاہی بن گئے۔ لیکن جو لوگ غرور جاہ، غرور نسب یا حسد کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف تھے وہ شیطان کی طرح عداوت میں بڑھتے چلے گئے۔

۲۔ یہ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ جس طرح ابلیس کے غم و غصہ کے علی الرغم آدم کو خلافت سے نوازا گیا، اسی طرح یہود کے حسد اور نفرت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو غلبہ و تمکن مل کر رہے گا اور یہود ابلیس کی طرح ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے۔

۳۔ نہایت لطیف اسلوب میں ان لوگوں کو دعوت ایمان دے دی گئی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے، لیکن ان کا ایمان نہ لانا کسی حسد اور تکبر کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس وجہ سے تھا کہ آپ کی دعوت کے پہلوا بھی تک ان پر اچھی طرح روشن نہ ہوئے تھے۔

۴۔ اس حقیقت کی طرف بھی رہنمائی کر دی گئی کہ آدم کی اس غلطی اور شیطان کے اس بہکاوے سے وحی کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ ہر دور میں اپنے انبیاء بھیجتا رہا ہے اور جس کی آخری کڑی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو لوگ اس ہدایت کی پیروی کریں گے وہ شیطان کی چالوں سے محفوظ ہوں گے۔ ورنہ انہیں جہنم میں جلنا ہوگا۔

سورہ اعراف میں:

۲۵ تا ۲۹ آیات میں یہ واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے، اس سے پہلے کی آیات میں کفار قریش کو ملامت کی گئی ہے کہ اللہ نے اس محترم سر زمین میں تم کو قوت و شوکت بخشی، خوف سے نجات کیا اور تمہارے لیے معاش و معیشت کی راہیں کھولیں، لیکن تم خدا کے فرمانبردار ہونے کے بجائے اس کے ناشکرے اور نافرمان بن گئے:

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ۔

(الاعراف: ۱۱۰)

اور ہم نے تمہیں اس ملک میں اقتدار بخشا اور تمہارے لیے معاش کی راہیں کھولیں لیکن تم بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہو۔

اللہ کے احسانات کا تقاضا یہ تھا کہ تم اس چیز کی پیروی کرتے جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے اور خدا کے سوا دوسرے معبودوں اور شریکوں کی پیروی نہ کرتے، یہ خیالی اولیاء اور اصنام تمہارے کام آنے والے نہیں ہیں:

اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ۔ (الاعراف: ۳)

پیروی کرو اس چیز کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اور اس کے ماسوا سر پرستوں کی پیروی نہ کرو، بہت کم ہی تم لوگ یاد دہانی حاصل کرتے ہو!

اس کے بعد قصہ آدم و ابلیس بنا کر قریش کو یاد دلایا کہ شیطان نے آدم اور ان کی ذریت کی

ابدی دشمنی کی جو قسم کھائی تھی، وہ قسم جس طرح آدم و حوا کو دھوکا دے کر اور جنت سے نکلوا کر اس نے پوری کی، اسی طرح اس نے اپنی وہ قسم تم پر بھی پوری کر لی ہے اور تم پوری طرح اس کے جال میں پھنس چکے ہو۔

دوسری بات یہ کہ یہاں چوں کہ معاملہ کفار قریش سے تھا جو سر تا پا شرک کی نجاستوں میں آلودہ تھے، اس لیے توحید کی اصل تعلیم پر توجہ دلائی گئی اور واقعہ کے اس نمایاں پہلو کو اجاگر کیا گیا کہ شیطان کا اہل ہدف عقیدہ توحید ہے، یہی وہ صراط مستقیم ہے جس پر گھات لگانے اور شب خون مارنے کا اس نے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ میں اس راہ سے ہٹا کر رہوں گا اور انسانوں کی اکثریت اس سے منحرف ہو کر خدا کی ناشکری کرنے والی بن جائے گی۔

قَالَ فِيمَا أُغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ، ثُمَّ لَا تَنبَهُم مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ۔ (عراف: ۱۶، ۱۷)

بولا چوں کہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا ہے اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے، ان کے پیچھے ان کے داہنے اور ان کے بائیں سے ان پر تاخت کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔

تیسری بات یہ کہ یہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ قریش نے ہدایت رسانی کو نظر انداز کر دیا ہے اس وجہ سے شیطان نے انہیں ورغلا کر اسی طرح ان کے کپڑے اتروا لیے، اس طرح ان کی یہ بے حیائی خدا کے حکم کی تعمیل میں نہیں بلکہ شیطان کی پیروی میں ہے، یہ شیطانی اغوا کی ایک کھلی ہوئی علامت تمہاری زندگی میں موجود ہے، تم نے اپنے رب کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر اور اس کے رسولوں کی دعوت سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیا اور اس نے تمہیں انسانی فطرت کے راستے سے ہٹا کر اس بے حیائی میں مبتلا کر دیا جس میں وہ تمہارے پہلے باپ اور ماں کو مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ فرمایا:

يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْآتِهِمَا، إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِمَّنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ۔ (اعراف: ۲۷)

اے بنی آدم شیطان تمہیں فتنے میں نہ ڈالنے پاپے جس طرح اس نے تمہارے باپ ماں کو جنت سے نکلوا چھوڑا، ان کے لباس اتروا کر کہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کر دے، وہ اور اس کا جھٹام کو وہاں سے تاڑتا ہے جہاں سے تم ان کو نہیں تاڑ سکتے۔

یہاں بنی آدم کے خطاب میں جو بلاغت ہے اسے بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ فرمایا کہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آدم کی اولاد اپنے باپ کے ساتھ شیطان اور اس کی ذریت کی اس دشمنی کو بھول جائے جو سراسر کینہ اور حسد پر مبنی تھی۔

سورہ حجر میں:

آغاز میں کفار کے بارے میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ آج یہ لوگ اس کتاب کا انکار کر رہے ہیں لیکن ایسا وقت آئے گا جب یہ تمنا کریں گے کہ کاش اس کتاب کو قبول کر کے مسلمان بنے ہوتے اور ہولناک نتائج سے محفوظ رہتے، جس سے اس بات کی وضاحت ہو گئی کہ آج جو لوگ ایمان نہیں لارہے ہیں اور غرور و تکبر کے ساتھ خدا کے رسول کی تکذیب کر رہے ہیں ان کے کفر اور تکبر کا اصل سبب یہ نہیں ہے کہ رسولوں کی صداقت ثابت کرنے کے لیے دلائل موجود نہیں ہیں یا ان کے مطالبوں کے جواب میں انہیں معجزات نہیں دکھائے جا رہے ہیں، بلکہ یہ لوگ دنیوی لذتوں میں مست ہیں اور لذیذ آرزوؤں کے خواب دیکھ رہے ہیں اور ابلیس کے اس فریب میں پھنس چکے ہیں۔ جس کی دھمکی اس نے اس وقت دی تھی جب اس کو آدم کے آگے سجدہ کا حکم ہوا تھا۔ اس کے بعد تفصیل سے یہ قصہ بیان ہوا ہے، جس میں چند مزید حکمتیں اور مضمرات ہیں:

۱۔ اس قصہ سے بعث بعد الموت پر بھی استشہاد کیا گیا ہے، چنانچہ واقعہ کا آغاز کرنے

سے پہلے قیامت اور حشر و نشر کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا
الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ، وَ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ
يَحْشُرُهُمْ، إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ۔ (حجر: ۲۳-۲۵)

اور بے شک یہ ہم ہی ہیں کہ زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی سب کے وارث ہیں اور ہم ان کو بھی جانتے ہیں جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں اور ان کو بھی جانتے ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں اور بے شک تمہارا خداوند ہی ہے جو ان سب کو اکٹھا کریگا بیشک وہ علیم اور حکیم ہے۔

اس کے بعد اس حقیقت پر واقعہ ابلیس و آدم کو بطور مثال بیان کیا گیا ہے اور یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ جس انسان کو ہم نے سیاہ اور بد بودار سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا ہے، اسے دوبارہ کیوں نہیں اٹھا کھڑا کر سکتے؟ یہی وجہ ہے کہ یہاں صرف یہی نہیں فرمایا کہ ہم نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ”حماً مسنون“ کا بھی اضافہ ہے جو دوسرے مقامات پر نہیں ہے۔ (۵۵) یہ بالکل اس طرز کا استدلال ہے جس کی مثالوں سے قرآن پاک بھر اڑا ہے۔ سورہ یس میں ہے:

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنْسَانُ مَا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ۔ (یس : ۷۷-۷۹)

کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا پھر وہ صریح جھگڑا لو بن کر کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے، کہتا ہے: ”کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں گی؟“ اس سے کہوا نہیں وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلے پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ چوں کہ یہاں قریش کے ابلیسانہ کردار پر چوٹ کرنی تھی، اس لیے ابلیس کا کردار قدرے تفصیل سے دکھایا گیا ہے۔ چنانچہ ۳۱ تا ۴۴ آیات میں اس کی دھمکیاں وضاحت کے ساتھ نقل کی گئی ہیں۔

۳۔ اس واقعہ کے بعد قوم لوط، قوم شعیب، قوم ثمود وغیرہ کی عبرت ناک داستان بیان کی گئی ہے تاکہ ان اقوام کی سرگزشت بھی قریش کے سامنے آجائے، جنہوں نے ضد اور ہٹ دھرمی میں انکار کیا اور ابلیسی رعونت کا شکار ہو کر اپنی عاقبت تباہ کر لی۔

۴۔ چوتھی حقیقت یہ ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ قریش اپنی غلطی کے خود ذمہ دار ہیں، شیطان کا کوئی کام اس سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ ظاہر حیات دنیا سے دھوکہ دے کر بندگی کی راہ سے تم کو منحرف کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس سے دھوکا کھانا تمہارا اپنا فعل ہے جس کی کوئی ذمہ داری تمہارے اپنے سوا کسی اور پر نہیں ہے، چنانچہ سورہ ابراہیم میں اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے کہ قیامت کے دن شیطان اپنے تبعین سے اعلان برأت کرے گا وہ کہے گا:

إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعَدَ الْحَقُّ وَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِي

عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي - فَلَا تَلَوْ مُونِي
وَلَوْ مُوَا أَنْفُسَكُمْ مَا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ إِنِّي
كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِي مِنْ قَبْلُ - (ابراہیم: ۲۲)

بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو اس کی خلاف ورزی
کی اور مجھے تم پر کوئی اختیار نہیں تھا، پس میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے بات مان لی تو
مجھے ملامت نہ کرنا، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو، نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا اور نہ تم
میری فریاد رسی کر سکتے، تم نے جو مجھے شریک بنا لیا تو میں نے اس کا پہلے سے انکار کر دیا۔

سورہ بنی اسرائیل میں:

آیات ۶۱ تا ۶۵ میں آدمؑ و ابلیس کا تذکرہ ہے، اس سے پہلے کفار قریش کو اس بات پر تنبیہ کی
گئی ہے کہ تم اعراض و انکار کی پالیسی پر عمل نہ کرو اور اللہ نے جن نعمتوں سے تمہیں نوازا ہے ان کی
ناقدری نہ کرو بلکہ شکر و اطاعت کا رویہ اختیار کرو اس کے بعد قصہ آدمؑ و ابلیس کو بیان کیا گیا ہے
جس سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ان کے اعراض و انکار کا اصل سبب وہ ناشکری
اور استکبار ہے جو ان کے لیڈر ابلیس کی سنت ہے، جس طرح ابلیس کو جب حکم ہوا کہ آدمؑ کو سجدہ
کرے تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں ایک برتر مخلوق ہوں، ایک خاکی مخلوق کو کس طرح سجدہ
کر سکتا ہوں اسی طرح یہ لوگ بھی خدا کی نعمتیں پا کر سیادت و چودھراہٹ کے پندار میں اندھے
ہو گئے ہیں اور ان کا یہ پندار ان کو اجازت نہیں دے رہا ہے کہ وہ تمہیں رسول مان کر اپنی لیڈری
سے دست بردار ہو جائیں۔

چنانچہ اس واقعہ کے بعد ۶۶ تا ۷۲ آیات میں انسان کی اس حالت کی تمثیل بیان کی گئی ہے
کہ جب وہ کسی مصیبت میں پکڑا جاتا ہے تب وہ خداوند کو پکارتا اور اس کے آگے روتا اور گڑگڑاتا
ہے، لیکن جو نہی اس مصیبت سے نجات پا جاتا ہے وہ پھراکڑنے اور سرکشی کرنے لگتا ہے اور یہ بھول
جاتا ہے کہ خدا چاہے تو پھر اسی حالت میں گرفتار کر سکتا ہے پھر انسان کی یہ کیفیت بیان کی گئی کہ:

وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا. (بنی اسرائیل: ۶۷) اور انسان بڑا ہی ناشکر ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس سورہ کے آغاز میں شرک کی تردید کی گئی ہے اور اموال و اولاد میں

دوسری ہستیوں کو شریک کرنے پر کفار کو ملامت کی گئی ہے۔ فرمایا:

أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا، إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا، وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا وَ مَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا۔
قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذَا لَابَتَّغُوا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا، سُبْحٰنَهُ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا۔ (بنی اسرائیل : ۴۰-۴۳)

کیا تمہارے رب نے تمہارے لیے تو بیٹے مخصوص کیے اور اپنے لیے فرشتوں میں سے بیٹیاں بنا لیں، یہ تو تم بڑی ہی سنگین بات کہتے ہو۔ اور ہم نے اس قرآن میں گونا گوں اسلوبوں سے یہ بات واضح کر دی کہ وہ یاد دہانی حاصل کریں، لیکن یہ چیز ان کی بے زاری ہی میں اضافہ کیے جا رہی ہے۔ کہہ دو کہ اگر کچھ اور الہ بھی اس کے شریک ہوتے جیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں تو وہ عرش والے پر ضرور پڑھائی کر دیتے، وہ پاک اور برتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔
اس کے بعد یہ قصہ بیان کر کے گویا اس امر کی تصریح کر دی کہ مال و اولاد میں کسی کو شریک ٹھہرانا شیطان کی گمراہیوں میں سے ہے۔
سورہ طہ میں:

اس سورہ میں حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت تفصیل سے بیان کی گئی ہے، پھر آیت ۹۹ اور اس کے بعد کی آیات میں نئے دلائل اور نئے اسلوب کے ساتھ پھر وہی بات دہرائی گئی، آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ۔ وَ قَدْ اَتَيْنَكَ مِنْ لَدُنَّا ذِكْرًا مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وِزْرًا۔ (۹۹-۱۰۰)

اس طرح ہم تمہیں ماضی کی سرگزشتیں بھی سناتے ہیں اور خاص اپنے پاس سے تمہیں بھی یاد دہانی عطا کی ہے جو اس سے اعراض کریں گے وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے۔
یعنی یہ صرف ماضی کی سرگزشت نہیں ہے بلکہ یہی کچھ تمہارے اور تمہارے مخالفین کے ساتھ بھی پیش آرہا ہے اور پیش آئے گا، اس کے بعد آیت ۱۱۵ سے قصہ آدم و ابلیس شروع ہو گیا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ آج جو لوگ تمہاری اس یاد دہانی سے اعراض اور دوسروں کو برگشتہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ شیطان کا کردار ادا کر رہے ہیں، اس لیے انہیں شیطان کا انجام بد بھگتنے کے لیے تیار بھی رہنا چاہیے۔

دوسری بات یہ کہ اس قصہ سے معا پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ قرآن جس تدریج کے ساتھ اتر رہا ہے، اسی تدریج کے ساتھ لوگوں کو سناؤ، اس تدریج میں حکمت ہے اس کے لیے جلدی نہ کرو، جلدی میں خیر و برکت نہیں ہے، یہ بادشاہ حقیقی کا فرمان ہے، کسی سائل کی درخواست نہیں ہے، اس لیے لوگوں کے رد و قبول سے بے نیاز ہو کر جس تدریج اور ترتیب کے ساتھ یہ اتر رہا ہے لوگوں کو سناؤ رہو۔ اس کے بعد حضرت آدم کا قصہ بیان ہوا ہے جس سے گویا اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہی عجلت آدم کی لغزش کا سبب بنی انسانی فطرت کے اس ضعف سے ابلیس نے فائدہ اٹھایا اور آدم کو ورغلا کر اللہ کی اس ہدایت سے غافل کر دیا جو ان کو ایک خاص درخت کے پھل سے اجتناب کے لیے کی گئی تھی، مقصود یہ ہے کہ یہ عجلت کسی کو بھی راس نہیں آتی ہے، اس سے پہلے حضرت موسیٰ کی داستان میں بھی یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ ان کی عجلت بھی ان کی اور ان کی قوم کے لیے ایک سخت آزمائش بن گئی، ان واقعات سے آنحضور کو یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ دعوت کے معاملہ میں جلدی نہ کریں بلکہ صبر و عزم کے ساتھ درجہ بدرجہ جس طرح آپ کو ہدایت دی جا رہی ہے اپنے کام میں لگے رہیں، اگر آپ نے جلدی کی تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ آپ کی امت کی تربیت میں کمی رہ جائے اور کوئی شیطان یا سامری اس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو کسی فتنہ میں مبتلا کر دے۔

سورہ ص میں:

اس سورہ کے آغاز میں بتایا گیا تھا کہ یہ کتاب قرآن تو ایک نصیحت اور یاد دہانی ہے لیکن یہ کفار کبر و غرور میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ، بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ۔ (ص: ۱۰)

یہ سورہ ص ہے، قسم ہے یاد دہانی سے معمور قرآن کی (کہ اس کی ہر بات برحق ہے) بلکہ

جن لوگوں نے اس کا انکار کیا وہی گھمنڈ اور مخاصمت میں مبتلا ہیں۔

اس کے بعد ماضی کی بعض سرکش قوموں کا حوالہ ہے، جنہوں نے اللہ کے رسول کے ساتھ یہ تکبرانہ روش اختیار کی اور بالآخر کیفر کردار کو پہونچیں، پھر حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور دوسرے انبیاء کا حوالہ ہے، جنہوں نے بے مثال قوت و حشمت حاصل کرنے کے باوجود تکبر کا رویہ اختیار نہ کیا بلکہ ان کی شوکت و قوت میں جتنا ہی اضافہ ہوتا گیا، اتنی ہی ان کی شکر گزاری اور

انابت ترقی کرتی گئی۔ آخر میں ۷۱ تا ۸۸ آدم و ابلیس کا ماجرا بیان ہوا ہے اور اس کے حوالے سے اس کبر و عونت کا شجرہ نسب بیان کر دیا، گویا قریش کو اس آئینہ میں دکھایا ہے کہ وہ جس گھمنڈ میں مبتلا ہو کر رسول کی تکذیب کر رہے ہیں، یہ صالحین کی نہیں بلکہ ابلیس کی میراث ہے، اس لیے اگر یہ اسی سنت کو زندہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، تو اس انجام کے لیے بھی تیار رہیں جو ابلیس اور اس کی پیروی کرنے والوں کا ہوگا۔

سورہ کہف میں:

اس سورہ میں آدم و ابلیس کا ماجرا بیان کرنے سے پہلے اس دنیوی زندگی کی تمثیل پیش کی ہے جس کی محبت میں اندھے ہو کر یہ کفار قریش قرآن اور پیغمبر اسلام کی باتیں سننے کو تیار نہیں تھے، فرمایا کہ اس دنیا کی جنتی زینتیں اور رونقیں ہیں وہ ساتھ جانے والی نہیں ہیں صرف آدمی کے اعمال صالحہ اس کے ساتھ جائیں گے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَا إِذَا نَزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ فَأُخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَّاحُ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا، الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ وَ الْبَقِيَّةُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَ خَيْرٌ أَمْلًا۔ (کہف: ۴۵، ۴۶)

اور ان کو اس دنیوی زندگی کی تمثیل بناؤ کہ اس کو یوں سمجھو کہ بارش ہو جس کو ہم نے آسمان سے اتارا پس زمین کی نباتات اس سے خوب اچھیں پھر وہ چور ہو جائیں جس کو ہوائیں اڑا لے پھریں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ مال و اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والے اعمال صالحہ باعتبار ثواب اور باعتبار امید تمہارے رب کے نزدیک بہتر ہیں۔

اس کے بعد آدم و ابلیس کی داستان بیان کر دی تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ مال و اولاد پر سمجھنا اور دنیوی زندگی پر فریفتہ ہونا ابن آدم کا نہیں بلکہ شیطان کا و طیرہ ہے جس نے تمہارے جد امجد آدم کو ایسی ہی زندگی کی دلفریبیاں دکھا کر خدا کی حکم عدولی پر اکسایا تھا۔

اس طرح دیکھیے واقعہ ایک ہے لیکن ہر جگہ لواحق و تضمینات، جملوں کی ساخت و ترتیب، پس منظر اور پیش منظر بدلے ہوئے ہیں اور ہر جگہ مختلف و منفرد پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے کہیں آدم کی خلافت اور اس کے تقاضوں پر زور دیا گیا ہے، کہیں اتباع غیر اللہ کے انجام بد سے متنبہ کرنے کے لیے

یہ داستان بیان ہوئی ہے، کہیں دنیوی زندگی کی زینتوں اور رونقوں پر تنقید کرتے ہوئے اس واقعہ سے مدد لی گئی ہے لیکن مجال نہیں کہ کہیں اکتاہٹ یا واقعہ کا بے جا طول یا تکرار کا عیب محسوس ہو۔

قصہ ابراہیمؑ مختلف سورتوں میں:

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی داستان قرآن میں مختلف مواقع پر بیان ہوئی ہے لیکن ہر جگہ مقصد اور مدعا دوسری جگہوں سے مختلف اور اسلوب بیان بدلا ہوا ہے، مثال کے طور پر سورہ بقرہ میں سب سے پہلے آیات ۱۲۴ تا ۱۲۸ میں یہ قصہ بیان ہوا ہے جس کے چند مضمرات یہ ہیں:

۱۔ حضرت ابراہیمؑ کو امامت و پیشوائی کا جو منصب اللہ نے عطا فرمایا تھا وہ بطور وراثت نہیں بلکہ خاص عطیہ الہی تھا، اس وجہ سے ان کی ذریت میں سے بھی وہی لوگ اس منصب کے سزاوار ہوں گے جو اس منصب کے شایان شان صفات کے حامل ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا:

إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا، قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِي، قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظالمين۔ (بقرہ: ۱۲۴)

اس نے کہا میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں ابراہیم نے عرض کیا، اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟ اس نے جواب دیا، میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے بیت اللہ کی تعمیر کے وقت ایک امت مسلم برپا کرنے اور ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول مبعوث کرنے کی دعا کی تھی۔ (۵۶) (بقرہ: ۱۲۸-۱۲۹)

۳۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس دعاے ابراہیمی کے مظہر اور اسی ملت ابراہیمی کے داعی ہیں، (۵۶) اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جن صفات کی پیغمبر کے لیے دعا کی تھی (یعنی تلاوت آیات، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعینہ انہی صفات کے ساتھ مبعوث ہوئے اور آپ نے امتیوں کے اندر عملاً وہ سارے کام انجام دیے جن کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی تھی۔ سورہ جمعہ میں فرمایا:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَ يُزَكِّيهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ إِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ (جمعہ: ۲)

وہی خدا ہے جس نے بھیجا امیوں میں ایک رسول جو ان کو پڑھ کر سنا تا ہے، اس کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

۴۔ ان حقائق کا تقاضا ہے کہ اہل کتاب یہودیت یا نصرانیت کے تعصب میں مبتلا نہ ہوں بلکہ اس ملت ابراہیمی کی پیروی کریں جس کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔
فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا، وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ۔ (بقرہ: ۱۳۷)

پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو ہدایت پر ہیں اور اگر اس سے منہ پھیریں تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔

اسی سورہ میں دوبارہ آیت ۲۵۸ میں حضرت ابراہیم کی زندگی کے ایک مخصوص پہلو پر زور ڈالنے کے لیے آپ کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جس کا مقصد اس سنت الہی کی تمثیلی وضاحت ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں جاری ہے، وہ سنت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی نعمتوں کو اس کا فضل قرار دینے کے بجائے ان کو اپنا حق سمجھتے ہیں، جو نعمتوں پر خداے منعم کا شکر گزار ہونے کے بجائے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہوتے ہیں، جو خدا کی فرمانبرداری کے بجائے اپنی خدائی کے تحت بچھاتے ہیں ان پر ہدایت کی راہ نہیں کھلا کرتی، ایسے لوگ حق واضح ہونے کے بعد بھی بحث اور کٹ جھتی کی کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈھ ہی لیتے ہیں اور اگر بچاؤ کی کوئی راہ نظر نہ آئے تو وہ نمرود کی طرح ششدر اور مبہوت تورہ جاتے ہیں لیکن حق کی قبولیت کا دروازہ پھر بھی ان پر نہیں کھلتا۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ، أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ، أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ۔ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ، قَالَ أَنَا أَحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔ (بقرہ: ۲۵۷-۲۵۸)

اللہ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لاتے ہیں وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا

ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے کارساز طاغوت بنتے ہیں وہ ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف دھکیلتے ہیں، یہی لوگ دوزخی ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا جب کہ ابراہیم نے کہا میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے وہ بولا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں، ابراہیم نے کہا کہ یہ بات ہے تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو اسے پچھتم سے نکال دے تو وہ کافر یہ سن کر بھونچکا رہ گیا اور اللہ ظالموں کو راہیاب نہیں کرتا۔

سورہ انعام میں:

حضرت ابراہیم کی سرگزشت ۷۴ تا ۹۰ کی آیات میں بیان ہوئی ہے، اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہے کہ ان کفار قریش سے کہہ دو کہ کیا حق واضح ہو جانے اور اللہ کی ہدایت آجانے کے بعد ہماری مت ماری ہوئی ہے کہ ہم صحرا میں گم کردہ قافلے کی طرح بھٹکتے پھریں؟ ہم تو اب اسی راہ پر چلیں گے جو خدا نے ہمارے لیے کھولی ہے اس کے بعد حضرت ابراہیم اور ان سے پہلے اور ان کے بعد پیدا ہونے والے تمام انبیاء کا حوالہ دے کر بتایا گیا ہے کہ ان سب کی دعوت یہی تھی جو یہ پیغمبر دے رہے ہیں، پھر نبی کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم بہر شکل اسی ہدایت یافتہ گروہ کی ہدایت کی پیروی کرو اگر تمہاری قوم یہ بات نہیں سنتی تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ تمہاری ذمے داری صرف دعوت و تبلیغ کی ہے، ان کے دلوں میں ایمان اور ہدایت اتار دینا تمہارا کام نہیں ہے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهِدَاهُمُ اقْتَدِهْ - قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا
إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرًا لِلْعَالَمِينَ - (انعام: ۹۰)

یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی تو تم بھی انہی کے طریقے کی پیروی کرو، اعلان کرو، میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب نہیں، یہ تو بس عالم والوں کے لیے ایک یاد دہانی ہے۔

سورہ توبہ میں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے سے پہلے نبی اور اہل ایمان کو اس بات کی سختی سے تاکید کی گئی ہے کہ جن لوگوں پر حق پوری طرح واضح کیا جا چکا ہے اور جن سے اتمام حجت کے بعد

اعلان برأت ہو چکا ہے، پھر بھی وہ ایمان نہ لائے ان کے لیے اہل ایمان مغفرت نہ مانگیں، اس لیے کہ اس قسم کے مخالفین اور دشمنانِ اسلام خدا کے غضب کے مستحق ہیں ان کے لیے رشتہ قرابت یا کسی اور رابطہ محبت کی بنا پر رحمت کی دعا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حمیت قرابت حمیت حق پر غالب ہے، (۵۷) اس کے بعد حضرت ابراہیم کا ذکر آیا ہے۔

وَ مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيمَ لِابِيهِ اِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا اِيَّاهُ، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ اَنَّهُ عَدُوٌّ لِلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ، اِنَّ اِبْرَاهِيمَ لَآوَاهٌ حَلِيْمٌ۔ (توبہ: ۱۱۲)

اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت مانگنا صرف اس وعدے کے سبب سے تھا جو اس نے اس سے کر لیا تھا پھر جب اس پر واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس سے اعلان برأت کر دیا، بے شک ابراہیم بڑا ہی رقیق القلب اور بردبار تھا۔

اس سے قبل کی جو آیت ہے اسے بھی سامنے رکھیے تاکہ ربط اور پس منظر واضح رہے:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْا اَوْلٰى قُرْبٰى مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحَابُ الْجَحِيْمِ۔ (۱۱۳)

نبی اور مومنین کے لیے روا نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت مانگیں، اگرچہ وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں جب کہ یہ ظاہر ہو چکا کہ یہ جہنم میں جانے والے لوگ ہیں۔

یعنی حضرت ابراہیم نے جو کچھ کیا وہ محض ایک وعدہ کا ایفاء تھا جو وہ اپنے باپ سے کر چکے تھے پھر یہ اس وقت کا معاملہ ہے جب ان پر بات پوری طرح واضح نہیں ہوئی تھی کہ باپ فی الحقیقت اللہ کا دشمن ہے لیکن جب اس کی دشمنی آشکارا ہو گئی تو اعلان برأت کر دیا۔
سورہ ہود میں:

حضرت ابراہیم کا تذکرہ پچھلے رسولوں اور ان کی قوموں کے ضمن میں ہوا ہے، مقصود یہ ہے کہ انبیاء اور ان کے اہل ایمان ساتھی محفوظ رہے اور منکرین و مکذبین پر خدا کا عذاب آدھمکا اور وہ اس کی لپیٹ سے نہ بچ سکے، اس لیے قریش نے آج جو روش اختیار کر رکھی ہے اس کا انجام بھگتنے کے لیے وہ تیار رہیں اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دکھلانا ہے کہ آج جو کچھ تمہیں پیش آرہا ہے بعینہ وہی کچھ تم سے پہلے کے رسولوں کو بھی پیش آچکا ہے، اس لیے حالات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صبر و عزیمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے کی ضرورت

ہے، فرمایا:

وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلَنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى قَالُوا سَلَامًا، قَالَ سَلَامٌ،
فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيذٍ، فَلَمَّا رَأَى أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ
وَ أَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أُرْسَلْنَا إِلَى قَوْمِ لُوطٍ
وَإِمْرَأَتُهُ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَقَ وَ مِنْ وَرَاءِ اسْحَقَ
يَعْقُوبَ قَالَتْ يَا وَيْلَتَى ءَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَ هَذَا بَعْلِي شَيْخًا، إِنَّ
هَذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ قَالُوا أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحِمَتُ اللَّهِ وَ
بَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَجِيدٌ۔ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ
إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَ جَاءَتْهُ الْبُشْرَى يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ، إِنَّ إِبْرَاهِيمَ
أَوَّاهٌ مُنِيبٌ، يَا إِبْرَاهِيمُ أُعْرِضْ عَنْ هَذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَ إِنَّهُمْ
آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ۔ (هود: ۶۹-۷۶)

اور ابراہیم کے پاس ہمارے فرستادے خوش خبری لے کر آئے، کہا سلامتی ہو، اس نے
بھی کہا سلامتی ہو، دیر نہیں گزری کہ اس نے ان کے آگے بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا پھر
جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو اس نے ان میں اجنبیت
پائی اور ان کی طرف سے ایک خدشہ محسوس کیا وہ بولے کہ تم اندیشہ نہ کرو ہم تو قوم لوط
کی طرف بھیجے گئے ہیں اور اس کی بیوی پاس کھڑی تھی، وہ ہنسی پھر ہم نے اس کو اسحاق کی
خوش خبری دی اور اس کے آگے یعقوب کی، وہ بولی کہ ہائے شامت! کیا میں اب بچہ جنوں
گی جب کہ میں خود بھی ایک بڑھیا ہوں اور میرے شوہر بھی بوڑھے ہیں! یہ تو ایک
نہایت ہی عجیب بات ہوگی، وہ بولے کیا خدا کی بات پر تعجب، اللہ کی برکتیں اور رحمتیں
نازل ہوں، آپ پر اہل بیت نبی، بے شک وہ سزاوار حمد و بزرگ ہے تو جب ابراہیم کا
خوف دور ہوا اور اس کو بشارت ملی تو وہ ہم سے قوم لوط کے بارے میں بحث کرنے لگا، بے
شک ابراہیم نہایت ہی بردبار، درد مند اور اپنے رب کی طرف دھیان رکھنے والا تھا، اے
ابراہیم یہ بحث چھوڑو، اب تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور ان پر ایک ایسا عذاب آنے
والا ہے جو نالے نہ ٹالا جاسکے۔

سورہ ابراہیم میں:

یہاں حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ کرنے سے پہلے قرآن نے کفار قریش پر خدا کی بے شمار نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے اور پھر ان کا کفرانِ نعمت بھی بیان کیا ہے، فرمایا کہ اللہ نے انہیں حرم کی پاسبانی عطا کی اور اس کے طفیل میں تمام عرب کی سیادت و قیادت بخشی، ان کو بدویانہ اور گلہ بانی کی غیر مطمئن زندگی کی جگہ شہری زندگی کا سکون بخشا، ایک وادی غیر ذی زرع میں رزق و فضل کے دروازے کھولے، بارش، کشتی، دریا، سورج، چاند، شب و روز سب کو ان کی نفع رسانی میں سرگرم کیا پھر اس کے بعد قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی داستان بیان کر کے سب سے بڑی نعمت جو کفار قریش پر ہوئی اس کا بھی اظہار کر دیا یعنی بتوں کی پوجا اور شرکاء کے شرک سے اجتناب، لیکن انہوں نے ان ساری نعمتوں کی قدر نہ کی اور کفر و شکر کی زندگی اختیار کر لی اور بہت سے شرکاء و شفعاۓ ایجاد کر کے خلق خدا کو ان کی پرستش کی راہ پر لگا دیا۔

وَ اَتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ، وَ اِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا، اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ، وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ، رَبِّ اِنَّهُمْ اَضَلُّنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ، وَ مَنْ عَصٰنِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ - (ابراہیم: ۳۴-۳۶)

اور تم کو ہر چیز میں سے بخشا جس کے تم طالب بنے اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو گے تو ان کو شمار نہ کر پاؤ گے بے شک انسان بڑا ہی حق تلف اور ناشکر ہے، اور یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی کہ اے میرے رب اس سرزمین کو پر امن بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب! ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے تو جو میری پیروی کرے وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ انسان تو انسان اس سرزمین پر کسی جاندار کو ستانا بھی گناہ ٹھیرا، حج کے لیے چار مہینے محترم قرار دیے گئے، کفار قریش کو خانہ کعبہ کی بدولت پورے عرب کی حکمرانی نصیب ہوئی اور شرک سے اجتناب کا یہ طریقہ نکالا کہ اس میں برابر انبیاء

آتے رہے جنہوں نے شرک و بت پرستی کا استیصال کیا۔
سورہ مریم میں:

چوں کہ اس سورہ کا عمود توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال ہے اس لیے اس میں انبیاء کے حوالے سے یہ بات کہی گئی ہے کہ ان کی دعوت توحید کی دعوت تھی لیکن ان کے پیرو شرک میں مبتلا ہو گئے، اس لیے یہاں حضرت ابراہیمؑ کے قصے سے مکالمہ کا وہ حصہ نقل کیا گیا جو اس مقصد کے لیے موزوں اور مفید تھا، فرمایا:

وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا، إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا، يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا۔ يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ، إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَنِ عَصِيًّا، يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِنَ الرَّحْمَنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا۔ قَالَ أَرَأَيْتَ أَنْتَ عَنِ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ لَئِن لَّمْ تَنْتَهَ لِأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا۔
(مریم: ۴۱-۴۶)

اور کتاب میں ابراہیم کی سرگزشت کو یاد کرو بے شک وہ راست باز اور نبی تھا، یاد کرو جب کہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ! آپ ایسی چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ وہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں، اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ہے تو آپ میری پیروی کریں میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا، اے میرے باپ! شیطان کی پرستش نہ کیجیے، شیطان خدائے رحمن کا بڑا ہی نافرمان ہے، اے میرے باپ مجھے ڈر ہے کہ آپ کو خدائے رحمن کا کوئی عذاب آپکڑے اور آپ شیطان کے ساتھی بن کے رہ جائیں۔

وہ بولا اے ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو رہے ہو، اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا، تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور اور دفع ہو۔

سورہ انبیاء میں:

کفار قریش کو تنبیہ ہے کہ جو دعوت توحید آج رسول تمہیں دے رہے ہیں وہی تمام انبیاء

نے اپنی قوموں کو دی ہے:

أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً، قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ۔ هَذَا ذِكْرٌ مَنْ مَعِيَ
وَذِكْرٌ مَنْ قَبْلِي بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقَّ فَهُمْ مُعْرِضُونَ۔

(انبیاء: ۲۴)

کیا انہوں نے خدا کے سوا دوسرے معبود ٹھہرا رکھے ہیں؟ ان سے کہو کہ اپنی دلیل پیش کرو، یہ تعلیم ہے ان لوگوں کی جو میرے ساتھ ہیں اور ان لوگوں کی بھی جو مجھ سے پہلے ہوئے بلکہ ان میں سے اکثر حق سے بے خبر ہیں اس وجہ سے اعراض کیے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم کا وہ عملی کردار سامنے رکھ دیا گیا جو توحید کا کھلا اعلان اور شرک سے واضح برأت اور نفرت کا مظہر ہے۔ فرمایا:

فَجَعَلَهُمْ جُذَاذَا إِلَّا كَبِيرًا لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ قَالُوا مَنْ فَعَلَ
هَذَا بِالْهَيْتِنَا إِنَّهُ لَمِنَ الظَّالِمِينَ۔ قَالُوا سَمِعْنَا فَتَى يَدْعُهُمْ يُقَالُ لَهُ
إِبْرَاهِيمُ قَالُوا فَاتُوا بِهِ عَلَى أَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُونَ۔ قَالُوا أ
أَنْتَ فَعَلْتَ هَذَا بِالْهَيْتِنَا يَا إِبْرَاهِيمُ، قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ، هَذَا
فَأَسْأَلُوهُمْ إِنْ كَانُوا يَنْطِقُونَ۔ فَارْجِعُوا إِلَى أَنْفُسِهِمْ فَقَالُوا إِنَّكُمْ
أَنْتُمْ الظَّالِمُونَ۔ (انبیاء: ۵۸-۶۴)

پس اس نے ان (بتوں) کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، بجز ان کے ایک بڑے کے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں، وہ بولے کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی! بیشک وہ بڑا ہی ظالم ہے، لوگوں نے بتایا کہ ہم نے ایک جوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جس کو ابراہیم کہتے ہیں، انہوں نے کہا کہ اس کو لوگوں کے سامنے حاضر کرو تاکہ وہ بھی گواہ رہیں انہوں نے پوچھا کہ ابراہیم کیا یہ حرکت ہمارے معبودوں کے ساتھ تم نے کی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ حرکت کی ہے تو انہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں، تو ان کو ذرا تنبیہ ہو اور آپس میں بولے کہ بلاشبہ تم ہی ناحق پر ہو۔

اس طرح دیکھیے کہ مختلف مواقع پر قصہ کے جس پہلو کی ضرورت تھی اسے بیان کیا ہے، اور تکرار کا عیب کہیں پیدا نہیں ہونے پایا ہے۔

۷- قسم

قسم قرآن پاک کا ایک اہم اسلوب ہے جو نہایت اہم مقصد کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے، عام طور پر لوگوں کو یہ الجھن پیش آتی ہے کہ قرآن میں قسمیں کیوں کھائی گئی ہیں جب کہ قسم فی نفسہ اللہ کی عظمت کے منافی ہے کیوں کہ قسم وہ کھاتا ہے جو اپنی ذات کو حقیر سمجھتا ہے اور جس کو اپنی بات کی صداقت اور اس کی تاثیر پر یقین نہیں ہوتا۔

قرآن میں قسمیں نہایت اہم امور پر کھائی گئی ہیں مثلاً قیامت، توحید، رسالت وغیرہ اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان امور میں قسم کھانا بے سود ہے کیوں کہ اس سے نہ مخالف کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ موافق کو، پھر یہ کہ قسم ایسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو عظیم الشان اور بلند مرتبہ ہو۔ پھر غیر اللہ کے لیے قسم کھانا خدا کے لیے کیسے مناسب ہو سکتا ہے؟

لیکن قرآن پر گہری نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ قرآن میں نہایت اہم مقصد کے لیے یہ اسلوب استعمال ہوا ہے اور یہ قرآن کا اپنا ایجاد کردہ اسلوب نہیں ہے بلکہ دور جاہلیت میں یہ اسلوب مستعمل تھا، چنانچہ اوس بن حجر کہتا ہے:

و باللات والعزی و من دان دینھا و باللہ انّ اللہ منھن اکبر (۵۸)
(لات و عزی اور ان کے مذہب اختیار کرنے والوں کی قسم اور خدا کی قسم، اللہ ان سب سے بڑا ہے)

عبید بن الابریص کہتا ہے:

حلفت باللہ ان اللہ ذو نعم لمن یشاء و ذو عفو و تصفاح (۵۹)
(میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اللہ جس چیز پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے اور وہ عفو و در

گذر کرنے والا ہے)

نابغہ ذبیانی کہتا ہے:

حلفت فلم اترك لنفسك رية و لیس وراء اللہ للمرء مذهب (۶۰)
(میں نے قسم کھائی اور تمہارے لیے کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ چھوڑی اور اللہ کے سوا

آدمی کے لیے کوئی مذہب نہیں ہے)

عبداللہ بن ذبہ ذونواس اور حمیر کی شکست اور یمن سے ان کے خروج کے بعد کہتا ہے:

لعمرك ما للفتى من مفر مع الموت يلحقه والكبر

لعمرك ما للفتى صحوة لعمرك ما أن له وزراً (۶۱)

(بخدا موت اور کمزوری و ضعیفی سے کسی نوجوان کو چھٹکارا نہیں ہے، بخدا ان میں سے کوئی

مصائب سے نجات حاصل نہیں کر سکتا بخدا ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے)

قسم کا مقصد:

قرآن میں قسم اس لیے کھائی گئی ہے تاکہ مقسم علیہ کی تاکید ہو سکے اور مخاطب کے شک و

شبه کو دور کیا جاسکے۔ (۶۲)

ابن سیدہ کہتے ہیں کہ ”ایک شخص قسم اس لیے کھاتا ہے تاکہ وہ جس بات کی خبر دے رہا ہے اس

کو مؤکد بنا سکے، اور یہ ایک جملہ ہے جس کے ذریعے دوسرے جملہ کی تاکید مقصود ہوتی ہے“ (۶۳)

سیبویہ کے یہاں بھی قسم کا یہی مفہوم ہے وہ کہتا ہے کہ ”یاد رکھو قسم تمہاری گفتگو کو مؤکد

بنانے کے لیے ہے۔“ (۶۴)

علامہ ابن قیمؒ بھی اسی خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں ”قسم کا مقصد خبر کی تحقیق و تاکید ہے۔“ (۶۵)

سورہ طارق کی قسم کی بابت لکھتے ہیں کہ ”اللہ نے آسمان اور اس کے روشن ستاروں کی قسم

کھائی اور ان میں سے ہر ایک اس کی توحید کی نشانیوں میں سے ہے۔“ (۶۶)

اس سورہ کے وسط کی قسم کی بابت فرماتے ہیں کہ ”اللہ نے بارش والے آسمان اور نباتات

سے معمور زمین کی قسم کھائی اور ان میں سے ہر ایک اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو اس

کی پروردگاری پر دلیل ہے۔“ (۶۷)

سورہ بردج کے قسموں کی بابت لکھتے ہیں کہ ”یہ سب اللہ کی قدرت کی نشانیاں اور اس کی

وحدانیت کے دلائل ہیں۔“ (۶۸)

سورہ انشاق کے آخر میں قسم کی بابت فرماتے ہیں کہ ”یہ (یعنی شفق، لیل اور قمر) اور اس

طرح کی تمام چیزیں نشانیاں ہیں جو خدا کی ربوبیت پر دلیل ہیں اور اس کی صفات کمال کے علم کو

مستلزم ہیں۔“ (۶۹)

﴿ امام رازی نے قسم کے سلسلے میں مختلف باتیں کہی ہیں اور مختلف پہلوؤں سے قسم کی حکمت اور مقصد سمجھانے کی کوشش کی ہے، ایک قول ان کا یہ ہے کہ قسمیں استدلال کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ سابقہ دلائل کی تاکید کے لیے ہوتی ہیں، قسموں سے پہلے چوں کہ دلائل بیان ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے اصل اعتماد ان دلائل پر ہوتا ہے نہ کہ قسموں پر۔ مثال کے طور پر سوہ والصفات کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ”اللہ تعالیٰ نے دوسری سورتوں میں نہایت یقینی دلائل سے توحید، بعث اور قیامت کو ثابت کر دیا ہے، چونکہ یہ دلائل گزر چکے ہیں اور ان کا بیان ابھی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا ہے، اس لیے دلائل سے قطع نظر کر کے بطور تاکید قسم کا ذکر کیا۔“ (۷۰)

﴿ دوسرا قول یہ ہے کہ ”اس کلام سے مقصود بت پرستوں کے اس قول کی تردید ہے کہ یہ بت خدا ہیں، پس اس کی تردید میں گویا یوں کہا گیا کہ یہ مذہب اپنی رکاکت اور لغویت کے اعتبار سے ایسا ناقابل توجہ ہے کہ اس کی تردید کے لیے بس اسی طرح کی دلیل کافی ہے۔“

﴿ ان کے جواب کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ ”عرب جھوٹی قسموں سے پرہیز کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ جھوٹی قسمیں مصیبت لاتی اور آبادیوں کو ویرانوں میں تبدیل کر دیتی ہیں، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت ہی اعلیٰ و اشرف چیزوں کی قسمیں کھائیں اور آپ کی بلندی و استحکام میں اضافہ ہی ہوتا گیا، اس سے ان پر یہ بات منکشف ہوئی کہ آپ کی قسمیں جھوٹی نہیں ہیں ورنہ آپ ان کی آفتوں اور تباہ کاریوں سے کبھی نہیں بچ سکتے تھے۔“

﴿ چوتھا قول یہ ہے کہ ”تمام قسمیں جو اللہ نے کھائی ہیں وہ دراصل دلائل ہیں جو قسموں کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں“

﴿ ان کا پانچواں قول یہ ہے کہ ”قسم کا مقصد مقسم بہ کی عظمت و جلالت قدر کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔“ (۷۱)

زرکشی اور سیوطی کا بھی یہی قول ہے کہ ”قسم کا مقصد خبر کی تحقیق و تاکید ہے۔ ان حضرات کے نزدیک ”واللہ یشہد ان المنافقین لکاذبون“ (منافقین: ۱) جیسی آیات بھی قسم پر مشتمل ہیں، گرچہ ان میں گواہی دینے کی خبر ہے، ان کے نزدیک چوں کہ یہاں خبر کی تاکید کے لیے شہادت کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس لیے اسے بھی قسم قرار دیا ہے۔ (۷۲)

علامہ ابوالقاسم القشیری کہتے ہیں کہ اللہ نے کمال حجت و تاکید کے لیے قسم کا تذکرہ کیا ہے

کیوں کہ فیصلہ دو چیزوں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے یا تو گواہی موجود ہو یا قسم کھالی جائے، اور اللہ نے اپنی کتاب میں دونوں ہی طریقوں کا تذکرہ کر دیا ہے۔ فرمایا:

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ
لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (آل عمران: ۱۸)

اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور فرشتے اور سب اہل علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ اس زبردست حکیم کے سوانی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

قُلْ إِي وَ رَبِّي إِنَّهُ لَحَقُّ (يونس: ۵۳) (۷۳)

کہو میرے رب کی قسم یہ بالکل سچ ہے۔

علامہ فرائی نے دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی قسمیں آئی ہیں، استدلال و استشہاد کے لیے آئی ہیں، وہ دراصل فطری دلیلیں اور تاریخی شہادتیں ہیں جو قسموں کی صورت میں پیش کی گئی ہیں، اور استدلال و استشہاد کا یہ اسلوب محض تنوع کی خاطر نہیں اپنایا گیا بلکہ اس میں بڑی بلاغتیں اور گونا گوں حکمتیں ہوتی ہیں۔ علامہ فرائی نے اپنے اس نظریے کی تائید میں کلام عرب سے بھی استدلال کیا ہے، مثال کے طور پر ابو العریان طائی حاتم کی مدح میں کہتا ہے:

قد علموا والقدور تعلمه و مستهل الفرور مطرداً
إن ليس عند اعترار طارقها لديدك إلا استلالها صدداً (۷۴)

(لوگ جانتے ہیں اور دیکھیں گواہ ہیں اور پیہم چلنے والی چمکدار چھریاں کہ زمانہ قحط میں شب میں آنے والے کی میزبانی میں تیری طرف سے صرف اتنی تاخیر ہوتی ہے جتنی دیر میں کسی جانور کو ذبح کرنے کے لیے) تو اپنی تلوار کھینچ سکے۔

راعی کے اشعار ہیں:

إن السماء و إن الريح شاهدة والأرض تشهد والأيام والبلد
لقد جریت بنی بدر ببغيتها يوم الهباءة يوماً ماله قود (۷۵)

(آسمان اور ہوا شاہد ہیں، زمین شاہد ہے، جنگیں شاہد ہیں اور سر زمین شاہد ہے کہ میں نے

بنی بدر کو ہباءۃ کی لڑائی میں ان کی سرکشی کا ایسا مزہ چکھایا، جس کا بدلہ ممکن نہیں ہے۔

دوسری جگہ کہتا ہے:

والخیل تعلم أنا فی تجاولنا عند الطعان أو لو بوؤسی و أنعام (۷۶)

(گھوڑے جانتے ہیں (گواہ ہیں) کہ ہم نیزہ بازی میں جولانی کے وقت کسی کے لیے تازیانہ

عذاب ہیں اور کسی کے لیے رحمت)

علامہ فراہیؒ نے اپنے عویٰ کی تائید میں فضل بن عیسیٰ بن ابان کا یہ وعظ بھی پیش کیا ہے:

سل الأرض فقل من شق أنهارك و غرس أشجارك و خبی

ثمارك فإن لم تجبك حوارًا إجابتك إعتبارًا۔

(زمین سے پوچھو تیری نہریں کس نے جاری کیں؟ تیرے درخت کس نے لگائے؟

تیرے پھل کس نے چنے؟ اگر زبان قال سے جواب نہ دے سکے گی تو زبان حال سے

ضرور جواب دے گی) (۷۷)

قرآن پاک سے مثالیں:

سورہ فجر میں آفاق کی بعض نشانیوں کی قسم کھائی گئی ہے جو درحقیقت اس بات پر شاہد ہیں

کہ اس کائنات کی ہر چیز کی باگ اس کے خالق کے ہاتھ میں ہے، وہی جس حد تک چاہتا ہے اس کو

ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اس کو روک لیتا ہے، مجال نہیں کہ کوئی شیء اس کی مقرر کی ہوئی حد

سے آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے۔ فرمایا:

وَالْفَجْرِ وَ لَيَالٍ عَشْرٍ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرُ، هَلْ فِي ذَلِكَ

قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ۔ (فجر: ۱-۵)

شاہد ہے فجر اور دس راتیں اور جفت و طاق، جب وہ چل کھڑی ہو، کیوں کہ ان میں تو ہے

ایک عاقل کے لیے عظیم شہادت!

سورہ مرسلات میں ہواؤں کے تصرفات کی شہادت اس بات پر پیش کی گئی ہے کہ لوگوں کو

جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے وہ کوئی انہونی بات نہیں ہے، اللہ نے جب چاہا اپنی ہواؤں اور بادلوں

کے ذریعے ہی سے پچھلی قوموں کو یہ کرشمہ دکھایا ہے اور جب چاہے گا قریش کو بھی یہ کرشمہ دکھا دے

گا اگر وہ سلامتی اور امن چاہتے ہیں تو خدا کی رحمت اور اس کی نعمت کے جو آثار ان کے آگے پیچھے

موجود ہیں، ان سے سبق حاصل کریں، خود اس کو اپنے لیے دعوت دینے کی جسارت نہ کریں فرمایا:

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا فَالْعَصْفِ عَصْفًا وَ النَّشْرَاتِ نَشْرًا فَالْفَارِقَاتِ فَرَقًا
فَالْمُلْقِيَاتِ ذِكْرًا عُذْرًا أَوْ نُذْرًا إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٍ - (مرسلات: ۱-۷)

شاید ہیں ہوا نہیں جن کی باگ چھوڑ دی جاتی ہے پس وہ اڑاتی ہیں غبار اندھا دھند اور شاہد ہیں
ہوائیں پھیلانے والی (بادلوں) کی، پھر وہ معاملہ کرتی ہیں جدا جدا پھر ڈالتی رہتی ہیں یاد دہانی
اتمام حجت کے طور پر یا آگاہ کر دینے کو بے شک جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے، وہ شدنی ہے۔

سورہ والتین میں جبل تین، جبل زیتون، طور سینا اور مکہ مکرمہ کی شہادت اس بات پر پیش کی
گئی ہے کہ اللہ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے لیکن اس کی سنت یہ ہے کہ جو لوگ اس
انعام کی قدر کرتے ہیں، فطرت صالحہ کو نشوونما دیتے ہیں اور انبیاء کی دعوت قبول کر کے ایمان و
عمل صالح کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کو تو ہم دائمی اجر سے نوازتے ہیں، لیکن جو لوگ اس نعمت کی
ناقدری کرتے ہیں اور ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار نہیں کرتے اس کو ہم اس گڑھے میں پھینک
دیتے ہیں جس سے بچانے کے لیے ہی ہم نے ان پر یہ انعام کیا تھا۔ فرمایا:

وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونَ وَ طُورِ سَيْنِينَ وَ هَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ - لَقَدْ خَلَقْنَا
الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ، ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ، إِلَّا الَّذِينَ
آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ، فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ فَمَا يُكَذِّبُكَ
بَعْدُ بِالذِّينِ، أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ - (تین)

شاہد ہیں جبل تین اور کوہ زیتون اور طور اور یہ پر امن سر زمین کہ ہم نے انسان کو بہترین
ساخت پر بنایا، پھر ہم نے اس کو ادنیٰ درجہ میں ڈال دیا جب کہ وہ خود کرنے والا بنا بجز ان
کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے، سو ان کے لیے ایک دائمی صلہ ہے، تو اب
کیا ہے جس سے تم جزاؤں کو جھٹلاتے ہو! کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں۔

سورہ عادیات میں یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ انسان بڑا ناشکر ہے، وہ خدا کی دی
ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر طرح
طرح کے فوائد سمیٹتا ہے، لیکن وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ خدا کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے
ہیں ان کو ادا کرنا بھی واجب ہے اور اس سے آگے بڑھ کر خدا کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو

اسی کے خلاف استعمال کرنے لگتا ہے۔ اور اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا کہ ایک دن جزا اور محاسبہ کا آنے والا ہے، جب سینوں کے راز تک اگلو لیے جائیں گے، اس حقیقت پر استدلال جنگلی گھوڑوں کے ذریعہ بطریق قسم کیا گیا ہے جو وفاداری اور جاں نثاری میں بے مثل ہوتے ہیں۔ فرمایا:

وَالْعَدِيَّاتِ ضَبْحًا، فَالْمُورِيَّتِ قَدْحًا فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا فَأَثَرُنَّ بِهِ
نَقْعًا فَوْسَطُنَّ بِهِ جَمْعًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ۔ (عادیات: ۱-۶)

گواہی دیتے ہیں ہانپتے، دوڑنے والے گھوڑے ٹاپوں کی ٹھوک سے چنگاریاں نکالنے والے، صبح کے وقت دھاوا کرنے والے، دوڑ سے غبار اٹھانے والے اور غبار کے ساتھ غول میں گھس جانے والے کہ انسان اپنے رب کا نہایت ناشکر ہے۔

سورہ یسین میں قرآن حکیم کو رسول اللہ کی رسالت کے اثبات میں بطور شہادت پیش کیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور لوگوں کو صراط مستقیم کی دعوت دے رہے ہیں، یہ قرآن ان لوگوں پر ایک عظیم احسان ہے جو اب تک خدا کی تعلیم و ہدایت سے بالکل محروم ضلالت میں بھٹک رہے تھے، یہ خود ان کی بد قسمتی ہے کہ استکبار کے سبب سے اس کو جھٹلا رہے ہیں۔ فرمایا:

يَسْ - وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ،
تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ۔ (یس: ۱-۵)

یہ سورہ یس ہے، شاہد ہے پر حکمت قرآن کہ تم رسولوں میں سے ہو، ایک نہایت سیدھی راہ پر جس کو نہایت اہتمام سے اتارا ہے خدائے عزیز و رحیم نے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ قرآن پاک میں صرف خدائے عز و جل ہی کی قسم نہیں کھائی گئی ہے بلکہ قرآن کریم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فرشتوں، یوم قیامت، آیات الہی، زمانوں اور مقدس مقامات وغیرہ کی بھی قسم کھائی گئی ہے اور انہیں بطور استدلال پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ یونس میں خدائے عز و جل کی قسم کھائی گئی ہے:

وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقُّ هُوَ قُلُوبُ إِيَّايَ وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقُّ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ۔ (یونس: ۵۳)

پھر پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ سچ ہے جو تم کہہ رہے ہو؟ کہو ”میرے رب کی قسم، یہ بالکل سچ

ہے اور تم اتنا بل بوتہ نہیں رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک سکو۔

اس طرح قرآن میں دس مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس ذات یا اپنی صفات علیا کی قسم کھائی ہے، قرآن نے رسول پاک کی حیات اور عمر کی قسم بھی کھائی ہے اور مقصد اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت جتنا ہے، کیوں کہ آپ کے علاوہ کسی اور کی زندگی کی قسم نہیں کھائی گئی، (۷۸) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ (حجر: ۷۲)

تیری جان کی قسم! اے نبی! اس وقت ان پر ایک نشہ سا چڑھا ہوا تھا جس میں وہ آپ سے باہر ہوئے جاتے تھے۔ (۷۹)

اللہ نے قرآن پاک کی بھی قسم کھائی ہے اور یہ قسم چھ مواقع پر موجود ہے، تین جگہ لفظ ”القرآن“ کی قسم کھائی گئی ہے جب کہ بقیہ تین جگہ مقسم بہ لفظ الکتاب ہے، فرمایا:

ص - وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ (ص: ۱) ص قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی۔

سورہ زخرف میں ہے:

حَم - وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ - (حَم: ۱-۳)

حَم - قسم ہے اس واضح کتاب کی کہ ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے، تاکہ تم لوگ اسے سمجھو۔ (۸۰)

فرشتوں کو بھی بطور شہادت قسمیہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، فرمایا:

وَالصَّافَّاتِ صَفًّا، فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًا فَالتَّالِيَاتِ ذِكْرًا، إِنَّ إِلَهَكُمْ لَوَاحِدٌ - (الصافات: ۱-۴)

قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم، پھر ان کی قسم جو ڈانٹ پھٹکار کرنے والے ہیں، پھر ان کی قسم جو کلام نصیحت سنانے والے ہیں، تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہی ہے۔

سورہ قیامت میں قیامت کی قسم کھائی گئی ہے، اسی طرح سورہ بروج میں بھی قیامت کی قسم کھائی گئی ہے۔ فرمایا:

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ - (بروج: ۲) اور قسم ہے اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

سورہ مدثر ۳۳، ۳۴، سورہ تکویر ۱۷، ۱۸، انشاق: ۱۷، فجر: ۱، ۲ وغیرہ مختلف آیات میں

زمانوں کی قسم کھائی گئی ہے، اسی طرح سورہ طور میں، سورہ تین میں، سورہ بلد میں، اور دوسری

آیات میں مقدس مقامات کی قسم کھائی گئی ہے، آیات الہی تو بے شمار آیات میں مقسم بہ کی حیثیت سے موجود ہیں۔

مقسم علیہ کی مختلف شکلیں

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات کے لیے قسمیں کھائی ہیں لیکن اگر ساری قسموں کا احاطہ کیا جائے تو وہ پانچ امور میں مخصوص نظر آتی ہیں:

۱- توحید:

مشرکین مکہ شرک میں لت پت تھے، انہوں نے متعدد معبودان باطل کو خدا کی ذات و صفات میں شریک کر رکھا تھا، اس لیے دلائل کے ذریعہ سب سے پہلے عقیدے پر ضرب لگائی گئی اور توحید خالص کا نظریہ ان کے سامنے پیش کیا گیا، کہیں سیدھے سادھے انداز میں دلائل کے ذریعہ انہیں توحید کی تعلیم دی گئی اور فرمایا گیا:

وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلَهٌ وَاحِدٌ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونَ، وَ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ لَهُ الدِّينُ وَ اجْبَأْ أَفْغِيرَ اللَّهُ تَتَّقُونَ۔ وَ مَا بِيَكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ۔ (نحل: ۵۱-۵۳)

اللہ کا فرمان ہے کہ ”دو خدا نہ بناؤ، خدا تو بس ایک ہی ہے لہذا تم مجھ ہی سے ڈرو اسی کا ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور خالصا اسی کا دین (ساری کائنات میں) چل رہا ہے، پھر کیا اللہ کو چھوڑ کر تم کسی اور سے تقویٰ کرو گے، تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اسی کی طرف دوڑتے ہو۔

اسی مقصد کے لیے قرآن نے قسم کا اسلوب بھی اختیار کیا ہے تاکہ ترہیب و تاکید میں

اضافہ ہو سکے، فرمایا:

وَالصَّافَاتِ صَفًّا، فَالزَّجْرَاتِ زَجْرًا فَالتَّالِيَاتِ ذِكْرًا۔ إِنَّ إِلَهَكُمْ

لَوَاحِدٌ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ رَبُّ الْمَشَارِقِ -
(صافات: ۱-۵)

قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم، پھر ان کی قسم جو ڈانٹنے اور پھٹکارنے والے ہیں، پھر ان کی قسم جو کلام نصیحت سنانے والے ہیں، تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہی ہے، وہ جو زمینوں اور آسمانوں کا اور تمام ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں اور سارے مشرقوں کا مالک۔

۲- اثبات رسالت:

قرآن پاک میں ایسی آیات بے شمار ہیں جو نبوت محمدی کی تصدیق کے لیے دلائل فراہم کرتی ہیں، قسم کے ذریعے بھی رسول پاک ﷺ کی تصدیق کی گئی ہے۔ سورہ نجم میں ہے:

وَ النَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ مَا ضَلَّٰ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوَىٰ وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ
الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (نجم: ۱-۴)

قسم ہے تارے کی جب کہ وہ غروب ہوا، تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے، وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

یعنی اے کفار قریش یہ قرآن جو تم کو سنایا جا رہا ہے یہ تمہارے کاہنوں اور نجومیوں کی قسم کا کوئی کلام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب و معتمد فرشتے کے ذریعے سے اپنے پیغمبر پر اسے وحی فرمایا ہے، اس میں کسی ضلالت و گمراہی کا کوئی شائبہ نہیں ہے، اس لیے تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ اس پیغمبر کی دعوت پر ایمان لے آؤ۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

وَالضُّحَىٰ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَاقَلَىٰ (الضحیٰ: ۱-۳)

شاید ہے وقت چاشت اور شاہد ہے رات جب پر سکون ہو جاتی ہے کہ تیرے خداوند نے نہ تجھے چھوڑا اور نہ تجھ سے بے زار ہوا۔

یہاں قسمیہ اسلوب کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی ہے کہ اس وقت آپ جس امتحان سے گزر رہے ہیں وہ خدا کی کسی بے التفاتی یا عتاب کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ درحقیقت اس

امتحان کا ایک حصہ ہے جو انسان کی روحانی و اخلاقی تربیت کے لیے ضروری ہے۔ اگر اس وقت تم مخالفوں کی مخالفت، انصار و اعوان کی قلت اور اسباب و وسائل کی کمی سے دوچار ہو یا آسمانی و روحانی کمک کے پہنچنے میں بظاہر تاخیر ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں چھوڑ دیا ہے یا تم سے بے زار ہو گیا ہے۔ بلکہ یہ تمہاری تربیت کے لیے تمہارا امتحان ہے۔ (۸۱)

۳۔ قرآن کی حقانیت پر دلیل:

قرآن نے خود اپنی حقانیت پر دلیل فراہم کی ہے اور تاکید کے لیے اس کی قسم کھائی ہے۔

فرمایا:

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّو تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ۔ (واقعہ: ۷۵-۷۷)

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے گرنے کے ٹھکانوں کی! اور بے شک یہ ایک بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو! بے شک یہ ایک باعزت قرآن ہے۔

یہاں شیاطین کی کمین گاہوں پر حملے کا جو انتظام اللہ نے کیا ہے، اس کا حوالہ دے کر مخاطبوں کو اللہ نے یہ تنبیہ فرمایا ہے کہ اس قرآن کو کاہنوں کی قسم کا کوئی شیطانی القاء گمان نہ کرو، بلکہ یہ ایک نہایت باعزت اور برتر کلام ہے جو اللہ کے پاس ایک محفوظ کتاب میں موجود ہے، جس تک اس کے پاک فرشتوں کے سوا کسی کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی، سورہ دخان میں کتاب مبین کی قسم کھا کر اس امر کی دلیل مہیا کرنا مطلوب ہے کہ اس کتاب کو ہنسی کھیل یا کسی مجذوب کی بڑنہ سمجھیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم اسکیم کا نہایت عظیم حصہ ہے اور اس کو اتارنے کے لیے اس نے وہ مبارک شب منتخب فرمائی جو اس کی طرف سے تمام امور حکمت کی تقسیم کے لیے خاص ہے، یعنی قرآن کی صداقت کے لیے کسی خارجی دلیل کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ کتاب خود بہت بڑی دلیل ہے۔ فرمایا:

حَمِّمٌ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَارَكَةٍ، إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ۔

(دخان: ۱-۳)

یہ حم ہے، قسم ہے واضح کر دینے والی کتاب کی بے شک ہم نے اس کو ایک مبارک رات میں اتارا ہے۔ بے شک ہم لوگوں کو آگاہ کر دینے والے تھے۔

۴- آخرت کی دلیل:

قرآن پاک میں قسمیہ اسلوب کے ذریعہ متعدد بار، آخرت، بعث بعد الموت اور حشر وغیرہ پر دلائل دیے گئے ہیں، چند آیات ملاحظہ ہوں:

زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ
بِمَا عَمِلْتُمْ، وَذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ۔ (تغابن: ۷)

جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ہرگز مرنے کے بعد نہیں اٹھائے جانے کے۔ کہہ دو! ہاں میرے رب کی قسم! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے پھر تم کو بتایا جائے گا جو کچھ تم نے کیا ہو گا اور یہ کام اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔

سورہ مریم میں فرمایا:

فَوَرَبُّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ
جِثْيًا۔ (مریم: ۶۸)

تیرے رب کی قسم ہم ضرور ان سب کو اور ان کے ساتھ شیاطین کو بھی گھیر لائیں گے، پھر جہنم کے گرد لا کر ان کو گھٹنوں کے بل گرا دیں گے۔

۵- انسانوں کی ناشکری پر دلیل:

قرآن پاک میں انسان کی ناشکری و نافرمانی پر قسمیہ انداز میں استشہاد کیا گیا ہے اور اسے تنبیہ و ملامت کی گئی ہے، فرمایا:

وَالْعَدِيَّةِ صَبْحًا فَالْمُورِيَّةِ قَدْحًا فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا فَأَأْتِرْنَ بِهِ
نَقْعًا فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ۔ (عادیات: ۱-۶)

گو اہی دیتے ہیں ہاپنے، دوڑنے والے گھوڑے ٹاپوں کی ٹھوکر سے چنگاریاں نکالنے والے، صبح کے وقت دھاوا کرنے والے، دوڑ سے غبار اٹھانے والے، اور غبار کے ساتھ غول میں گھس جانے والے کہ انسان اپنے رب کا نہایت ناشکر ہے۔

۶- تحکیم رسول پر دلیل:

قرآن نے اس امر کی بھی قسم کھائی ہے کہ رسول کی حیثیت ایک واجب الاطاعت ہادی کی

ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اذن کے تحت اس کو اس لیے مامور فرماتا ہے کہ لوگ جملہ معاملات میں اسی کے احکام کی اطاعت کریں اور اسے خدا کی حاکمیت قانونی و تشریحی کا مظہر سمجھیں۔ فرمایا:

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (نساء: ۶۵)

پس نہیں تیرے رب کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات میں تمہیں اپنا حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔

قسم کی بلاغتیں:

فن بلاغت پر مشتمل کتابوں میں قسم کی ادبی لطافتوں اور فوائد پر کچھ زیادہ مواد نہیں ملتا، علامہ عزالدین بن عبدالسلام نے بعض قرآنی آیات میں قسم اور جواب قسم کی محذوفات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (۸۲) البتہ مولانا فراہی نے اس پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ہے، انہوں نے قسم کے بعض فوائد پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

۱۔ قسم کا یہ اسلوب قول کی پختگی اور تاکید پر دلالت کرتا ہے، چنانچہ قرآن پاک میں رسولوں کا یہ قول مذکور ہے:

قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ۔
(یس: ۱۶-۱۷)

ان لوگوں نے کہا ہمارا پروردگار شاہد ہے کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں اور نہیں ہے ہماری ذمہ داری مگر کھلے طور پر پہونچا دینا۔

سورہ طارق میں ہے:

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ إِنَّهُ لَقَوْلُ فَصْلٍ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔ (۱۱-۱۲)

شاہد ہے آسمان پر نگار اور زمین پر شکاف کہ یہ دو ٹوک بات ہے اور ہنسی مسخری نہیں ہے۔

۲۔ چونکہ یہ انشاء کی صورت میں ہوتا ہے اس لیے مخاطب کے لیے تردید و انکار کی کوئی

گنجائش نہیں رہ جاتی۔ وہ جواب قسم کا آسانی سے انکار کر سکتا ہے کیونکہ وہ خبر کی صورت میں ہوتا

ہے لیکن نفس قسم کا انکار نہیں کر سکتا، کیوں کہ وہ انشاء کی شکل میں آتی ہے۔

۳۔ استدلال کے لیے یہی اسلوب زیادہ موزوں ہے کیوں کہ اس میں اختصار ہوتا ہے اور جب الفاظ کم ہوں تو مفہوم تمام حجابات سے مجرد ہو کر سہولت سے سامنے آجاتا ہے اور اس سے اس کی تاثیر اور زور میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استعارہ کبھی کبھی بلاغت میں تشبیہ پر فوقیت لے جاتا ہے۔

۴۔ اسلوب کی چوتھی خوبی یہ ہے کہ اس میں دلیل کے ڈھونڈنے میں سامع خود متکلم کے ساتھ شریک ہوتا ہے جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر عناد و اختلاف کا داعیہ کمزور پڑ جاتا ہے۔

۵۔ اس اسلوب میں دلیل اپنی معروف صورت سے ایک بالکل مختلف صورت میں سامنے آتی ہے جس کے سبب سے منکر کو مناظرہ کرنے اور جھگڑنے کی راہ نہیں ملتی۔

۶۔ جن سورتوں کے شروع میں قسمیں پائی جاتی ہیں، اہل ذوق جانتے ہیں کہ ان قسموں نے ان کو حسن و خوبی کا ایک عنوان جمال بخش دیا ہے، سورتوں کے اوائل میں یہ قسمیں اس طرح چمکتی ہیں جس طرح انگشتری میں نگینہ۔ بعض جگہ سورتوں کے بیچ میں بھی قسمیں آئی ہیں لیکن کم، مگر جہاں کہیں آئی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مطلع قصیدے کے بیچ میں آگیا ہو۔

۷۔ اس اسلوب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں دلیل دعویٰ سے پہلے سامنے آجاتی ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ یہ دلیل آہستہ آہستہ مخاطب کو اصل دعویٰ تک کھینچ لاتی ہے، اس کے برعکس اگر مخاطب پہلے ہی سے اصل دعویٰ کو سمجھ جائے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ کترا کر دوسری راہ اختیار کر لے۔

۸۔ قسم، کلام کی اس قسم میں سے ہے جس کو جوامع الکلم کہتے ہیں یعنی بظاہر تو وہ ایک مختصر سی بات ہوتی ہے لیکن اس کے اندر معانی کا ایک دفتر پوشیدہ ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مقسم بہ کے ساتھ استدلال کا پہلو مذکور نہیں ہوتا۔ اگر اس میں استدلال کے کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کر دیا جائے تب تو اس سے صرف ایک ہی دلیل پیدا ہوگی لیکن جب یہ صورت نہ ہو بلکہ استدلال کے پہلو کو غیر معین چھوڑ دیا جائے تو ایک ہی چیز کے اندر متعدد معانی اور گونا گوں پہلو استدلال و استنباط کے ہو سکتے ہیں اور ایک غور کرنے والی عقل اس کے اندر بے شمار دلیلیں نکال سکتی ہے۔ (۸۳)

یہاں قرآن پاک کی قسموں پر مفصل بحث مقصود نہیں ہے بلکہ صرف ایک اسلوب کی حیثیت سے اس پر مجمل گفتگو کی گئی ہے۔

۸- مخاطب

قرآن کے اسلوب مخاطب کا سمجھنا قرآن فہمی کے لیے ناگزیر ہے کیوں کہ جہت خطاب کی تبدیلی اور اس کے عموم و خصوص سے بڑی تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں اور اس صورت میں قرآن کا فہم اور اس کی معرفت دشوار ہو جاتی ہے۔

قرآن میں جب خطاب واحد سے ہوتا ہے اور وہاں کوئی صریح اور واضح قرینہ موجود نہیں ہوتا تو عام مفسرین فوراً یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں، حالاں کہ ایسے موقعوں پر خطاب کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

۱۔ پہلی صورت مخاطب واحد کی یہ ہے کہ نبی چوں کہ امت کا امام، عوام کا قائد اور قافلہ انسانیت کا رہبر ہوتا ہے، اس لیے اسے مخاطب بنایا جاتا ہے ورنہ اصل روئے سخن عوام کی جانب ہوتا ہے، اس طرح یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے تمام لوگوں سے ہوتا ہے۔

سورہ توبہ میں ہے:

وَإِنْ تُصِيبَكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِيبَكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرًا مِنْ قَبْلُ - (توبہ: ۵۰)

تمہارا بھلا ہوتا ہے تو انہیں رنج ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ منہ پھیر کر خوش خوش ملتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم نے پہلے اپنی معاملہ ٹھیک کر لیا تھا۔

یہاں تُصِيبُكَ میں خطاب واحد ہے اور بظاہر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہے لیکن مراد عام مومنین ہیں چنانچہ آگے کی آیت میں اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ فرمایا:

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا وَهُوَ مَوْلَانَا وَ عَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ - (توبہ: ۵۱)

ان سے کہو ہمیں ہر گز کوئی بھلائی یا برائی نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے، اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اہل ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

یعنی اہل ایمان کے لیے مصیبت اور راحت، دکھ اور سکھ، موت اور زندگی دونوں ہی میں خیر ہے ایک سے مومن کو صبر، کمزوریوں کی اصلاح اور توبہ و انابت کی تربیت ملتی ہے اور دوسری سے شکر نعمت، ادائے حقوق اور احسان کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے، یہ وہ جواب ہے جو مومنین کی طرف سے اوپر والی بات کا دیا گیا ہے، یہاں جواب میں جمع کا صیغہ (یُصِيبْنَا، لَنَا، مَوْلَانَا) اس امر کی دلیل ہے کہ اوپر والی آیت میں گرجہ خطاب نبی سے ہے لیکن مراد عام اہل ایمان ہیں۔

سورہ بنی اسرائیل میں ہے:

إِمَّا يَبُلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهِمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍ وَلَا تَنْهَرُهُمَا وَ قُلْ لَهُمْ قَوْلًا كَرِيمًا (۲۳)

اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو۔

اس آیت میں مخاطب بظاہر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں لیکن خطاب تمام اہل ایمان سے ہے، مسلمانوں کو اس بات کی تعلیم دینا مقصود ہے کہ اگر ماں باپ تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ ان کے خلاف دل میں کوئی بیزاری پیدا ہونے پائے اور نہ زبان سے ان کے سامنے کوئی حکم سوء ادب کا نکلے بلکہ جب بھی ان سے بات کرنے کا موقع آئے شریفانہ اور سعادت مندانہ لہجے میں بات کرو اور ان کی دلداری و تسلی کرتے رہو کیوں کہ خدا کے بعد تمہارے اوپر سب سے بڑا حق والدین ہی کا ہے۔

سورہ انعام میں ہے:

وَ كَذَّبَكَ بِهٖ قَوْمُكَ وَ هُوَ الْحَقُّ قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ لِّكُلِّ نَبَأٍ مُّسْتَقَرٌّ وَ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ (۶۶-۶۷)

(تمہاری قوم اس کا انکار کر رہی ہے حالانکہ وہ حقیقت ہے ان سے کہہ دو کہ میں تم پر حوالہ دار نہیں بنایا گیا ہوں، ہر خبر کے ظہور میں آنے کا ایک وقت مقرر ہے عنقریب تم کو خود انجام معلوم ہو جائے گا)

اس آیت میں ایک ہی شخص یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا گیا ہے اس کے بعد جو آیت آرہی ہے اس میں بھی مخاطب ایک ہی شخص کو کیا گیا ہے حالانکہ مقصود پوری امت

سے خطاب ہے۔ فرمایا:

وَ إِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى
يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَ إِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ

الذِّكْرِ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ - (۶۸)

(جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیوں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ
یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان تم کو
بھلاوے میں ڈال دے تو جس وقت تمہیں اس غلطی کا احساس ہو جائے اس کے بعد بھر
ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو)

یہاں خطاب ایک ہی شخص سے ہے لیکن درحقیقت پوری امت کو دو باتوں کی تلقین کرنا
ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی ذمے داری صرف یہ ہے کہ آیاتِ الہی کی تکذیب
کرنے والوں کی یاد دہانی کرادیں، لیکن اگر وہ قرآن کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے طنز و تضحیک کے
ترکش سنبھالے ہوئے اور مخالفت کے لیے آستین چڑھائے ہوئے ہیں تو اس وقت طرح دے جاؤ
اور جب ان کی یہ بحرانی کیفیت دور ہو جائے تو اس وقت ان کو سنانے اور سمجھانے کی کوشش کرو،
اس کے بعد جو آیت آرہی ہے اس میں اسی حقیقت کی مزید وضاحت کی گئی ہے اور خطاب بھی
صراحتاً تمام مسلمانوں کی جانب ہو گیا ہے:

وَ مَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَكِنْ ذِكْرٌ
لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (۶۹)

ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمے داری پر ہیزگار لوگوں پر نہیں ہے البتہ نصیحت
کرنا ان کا فرض ہے شاید کہ وہ غلط روش سے بچ جائیں۔

یعنی مسلمانوں کے اوپر ان ظالموں اور کافروں سے متعلق جو ذمے داری ہے وہ صرف اللہ
کی دعوت اور اس کے دین کو پہنچانے کی ہے تاکہ جس طرح وہ خدا سے ڈرنے والے ہیں اسی طرح
کفار بھی خدا سے ڈرنے والے بن جائیں ان کے کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہے
قرآن کی ایک دوسری آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

وَ قُلْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا

و يُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ
إِنَّكُمْ إِذَا مِثْلَهُمْ (نساء: ۱۴۰)

(اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہیں کی طرح ہو)

اس آیت میں بھی وہی بات کہی گئی ہے جو سورۃ انعام کی آیت میں بیان ہوئی ہے لیکن مفسرین نے انعام والی آیت کو اس آیت سے منسوخ قرار دیا ہے۔ (۸۴) لیکن غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ یہاں نسخ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ اس آیت میں تو صرف مسلمانوں کو کفار اور مکذبین کے ساتھ اس وقت بیٹھنے سے منع کیا گیا ہے جب وہ آیاتِ الہی کا مذاق اڑا رہے ہوں تا آنکہ وہ کسی اور شغل میں منہمک ہو جائیں اور آیاتِ الہی کے استہزاء سے باز آجائیں اور یہی حکم سورۃ انعام میں بھی ہے۔ (۹۵)

اسی اسلوب کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو، قرآن کہتا ہے:

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَ مِّن تَابٍ مَّعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ وَ لَا تَرْكُنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَيَمْسَكُوا النَّارَ وَ مَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ وَ أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَ زُلْفًا مِنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبُنَ السَّيِّئَاتِ ذَلِكَ ذَكَرَى لِلذَّاكِرِينَ۔
(ہود: ۱۱۲-۱۱۴)

پس تم جمے رہو جیسا کہ تمہیں حکم ملا ہے اور وہ بھی جنہوں نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے اور کج نہ ہونا بے شک جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اس کو دیکھ رہا ہے اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہو جو جنہوں نے ظلم کیا کہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ پکڑ لے اور تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی حامی نہ ہو، پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی اور نماز کا اہتمام کرو دن کے دونوں حصوں میں اور شب کے کچھ حصہ میں، بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں بدیوں کو، یہ یاد دہانی ہے یاد دہانی حاصل کرنے والوں کے لیے۔

یہاں لا تطغوا کہہ کر پوری امت کو رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے خطاب کیا گیا ہے، نبی

کے واسطے سے امت کو مخاطب کرنے کی مثال اس آیت میں بھی ملتی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنْ كَانَ اللَّهُ كَانَ عَلِيمًا
حَكِيمًا وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ إِنْ اللَّهُ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا۔

(احزاب: ۱-۲)

اے نبی اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کی باتوں پر کان نہ دھرو بیشک اللہ علیم و حکیم ہے اور پیروی کرو اس چیز کی جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے وحی کی جا رہی ہے، بیشک

اللہ ان تمام چیزوں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔

آخر میں جمع کا صیغہ (تعملون) لا کر گویا اس امر کی صراحت کر دی گئی کہ یہ خطاب امت

سے ہے، اس کے بعد فرمایا:

وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ
فِي جَوْفِهِ وَ مَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمُ اللَّائِي تُظَاهِرُونَ مِنْهُنَّ أُمَّهَاتِكُمْ وَ مَا
جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ۔ (احزاب: ۳-۴)

اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور بھروسے کے لیے اللہ کافی ہے اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل

نہیں رکھے اور نہ تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کر بیٹھتے ہو تمہاری مائیں بنایا اور نہ

تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے بیٹے بنایا یہ سب تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔

ان آیات میں بار بار جمع کے صیغوں اور ضمائر کا استعمال یہ صراحت کر رہا ہے کہ خطاب عام

امت مسلمہ سے ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر براہ راست لوگ مخاطب ہوں،

اس قسم کا طرز تخاطب کبھی کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کے پہلے یا بعد میں آتا ہے، ایسے

موقع پر لوگ بڑی الجھن میں مبتلا ہو جاتے ہیں چناں چہ ضمیروں کے آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے

مفہوم کو متعین کرنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے حالاں کہ ضمیروں کا یہ ہیر پھیر درحقیقت مرکب

مخاطب کے اسلوب کا نتیجہ ہوتا ہے اس لیے اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہوتی (۸۶) سورہ نساء

میں ارشاد ہوتا ہے:

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِتْنَةٍ وَاللَّهُ أَرَّكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوا أَتْرِيدُونَ أَنْ

تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ وَ مَنْ يُضِلِّ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا۔ (نساء: ۸۸)

پس تمہیں کیا ہوا کہ تم منافقین کے بارے میں دو گروہ ہو رہے ہو اللہ نے تو انہیں ان کے کیے کی پاداش میں پیچھے لوٹا دیا ہے کیا تم ان کو ہدایت دینا چاہتے ہو جن کو خدا نے گمراہ کر دیا ہے؟ جن کو خدا گمراہ کر دے تم ان کے لیے کوئی راہ نہیں پاسکتے۔

سورہ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیات میں قرآن کا اسلوب مخاطب ملاحظہ فرمائیے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَ قُولُوا انظُرْنَا وَ اسْمَعُوا وَ لِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَ مَا يُوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَ لَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِّنْ رَبِّكُمْ وَ اللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَ اللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔ مَانَسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلَهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ وَ مَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَ لَا نَصِيرٍ۔ (بقرہ: ۱۰۴-۱۰۷)

اے ایمان والو! تم ”رَاعِنَا“ نہ کہا کرو ”انظُرْنَا“ کہا کرو اور توجہ سے سنا کرو، کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے جن لوگوں نے کفر کیا اہل کتاب ہوں یا مشرکین، نہیں چاہتے کہ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے کوئی رحمت نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کے لیے خاص کرتا ہے جن کو چاہتا ہے، البتہ بڑے فضل والا ہے۔

جو کوئی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو نظر انداز کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے مانند دوسری لاتے ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست ہے نہ مددگار۔

ان آیات میں بھی أَلَمْ تَعْلَمْ میں خطاب واحد ہے، اور نبی کے واسطے کے بغیر تمام امت کو مخاطب کیا گیا ہے۔

تیسری آیت ملاحظہ ہو یہ آیت قوم عاد کی تیز و تند آندھی سے ہلاکت کے بیان میں ہے:

فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى كَأَنَّهُمْ أُعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٌ (حاقة: ۷)

پس تم دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھاڑے پڑے ہیں گویا کہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں۔

یہاں بھی خطاب عام ہے مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب اگر تو وہاں موجود ہوتا تو دیکھتا کہ اللہ کے عذاب نے ان کو اس طرح میدان میں پچھاڑ کے ڈال دیا ہے کہ گویا وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں جو ہوا کے زور سے ادھر ادھر لڑھکتے پھر رہے ہوں۔

چند ضروری نکات:

۱۔ اس اسلوب میں مخاطب کے موزوں اور بر محل الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں مثال کے طور پر قرآن نے جہاں امور فطرت کی تعلیم دی ہے جیسے توحید کی تعلیم، قرابت داروں اور یتیموں سے حسن سلوک کی تلقین وغیرہ وہاں ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ“ کہہ کر خطاب کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فرائض مجرد انسان ہونے کے ناطے سے ہر انسان پر لازم ہیں لیکن جب فرائض دین اور اوامر شریعت کی تعلیم دی جاتی ہے تو ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے یعنی یہ ذمہ داریاں اہل ایمان پر اس وجہ سے واجب ہیں کہ انھوں نے اپنے رب سے اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد کیا ہے۔

۲۔ قرآن میں جہاں استغفر اللہ کہہ کر نبی کو خطاب کیا گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اے نبی تم لوگوں کے لیے اللہ سے مغفرت چاہو مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِبِينَ خَصِيمًا وَاسْتَغْفِرِ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَالُونَ أَنفُسَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا لِيَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مِمَّا لَا يَرْضَى مِنَ اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا هَآئِنَّمِ هَوْلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُجَادِلِ اللَّهُ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْ مَنْ يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكَيْلًا وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَسْتَعْفِرِ اللَّهُ يَجِدِ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَى نَفْسِهِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا۔ (نساء: ۱۰۵-۱۱۱)

ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھایا ہے اور تم بد عہدوں کے حمایتی نہ بنو اور اللہ سے مغفرت

مانگو بیشک اللہ غفور رحیم ہے اور ان لوگوں کی وکالت نہ کرو جو اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو بد عہد اور حق تلف ہیں، یہ لوگوں سے تو چھپتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے حالاں کہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ وہ ناپسندیدہ سرگوشیاں کرتے ہیں اور اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے، یہ تم ہو جنہوں نے دنیا کی زندگی میں ان کی مدافعت کی تو قیامت کے دن اللہ سے کون ان کی مدافعت کرے گا یا کون ان کا ذمہ دار بنے گا اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرے یا اپنی جان پر کوئی ظلم ڈھائے پھر اللہ سے مغفرت چاہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پائے گا، اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا وبال اس کے سر آتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

ان آیات میں بظاہر خطاب کا رخ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس میں عتاب کا رخ ان مسلمانوں کی طرف ہے جو منافقین کی حمایت کرتے تھے۔ کہا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو تم ان لوگوں کے حمایتی اور وکیل نہ بنو جو اللہ اور رسول سے بد عہدی اور خیانت کر رہے ہیں، یہ لوگ انسانوں سے تو چھپتے ہیں اور چھپ چھپ کر اللہ و رسول کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہیں لیکن اس اللہ سے کہاں چھپ سکتے ہیں جو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ اپنی ناپسندیدہ سرگوشیوں میں مصروف ہوتے ہیں آیات ۱۰۹ اور ۱۱۰ میں یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ پیغمبر کو خطاب کر کے کن کے رویے پر سرزنش کی گئی ہے۔ (۸۷)

۳۔ نبی بندوں کے سامنے خدا کا ترجمان اور خدا کی بارگاہ میں بندوں کا وکیل ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کبھی خدا کی زبان سے وہ بندوں کو تنبیہ و تذکیر کرتا ہے اور کبھی بندوں کی طرف سے اللہ کے حضور مجادلہ اور عرض معروض کرتا ہے جس وقت وہ اللہ کی ترجمانی کرتا ہے اس وقت اس کو کسی ملامت گر کی ملامت اور جھگڑے کی پروا نہیں ہوتی اور جب بندوں کی طرف سے خدا کے دربار میں ترجمان بن کر حاضر ہوتا ہے تو وہ گریہ و زاری بھی کرتا ہے اور مجادلہ و مباحثہ بھی اور اسے اس بات کی مطلق تشویش نہیں ہوتی کہ بندوں کے گناہ بڑے ہیں اور اس باب میں اس کی سفارش مردود ہو جائے گی چنانچہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ اس سے اس انداز میں بات کرتا ہے کہ اس پر عتاب کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

چوں کہ نبی بندوں کا ترجمان ہونے کی حیثیت سے ان کے خیالات کی خدا کے سامنے

ترجمانی کرتا ہے اور بندوں سے خدا کے پیغام کی ترجمانی کرتا ہے اس لیے خدا بھی اس سے اسی حیثیت سے خطاب کرتا ہے گویا وہی پوری امت کا قائم مقام ہے۔

اس نکتے کو اگر سامنے رکھا جائے تو بہت سے اشکالات حل ہو جائیں گے اور قرآن و انجیل کی اکثر آیتوں کی صحیح تاویل میں بڑی آسانی ہوگی، علمائے نصاریٰ نے انجیل کی آیتوں اور حضرت مسیح کے اقوال کی توجیہ میں اسی لیے غلطیاں کیں، مثال کے طور پر حضرت مسیح کا یہ قول دیکھیے:

إِلٰهِي إِلٰهِي لِمَ خَذَلْتَنِيْ - (اے میرے خداوند کیوں تو نے مجھ کو چھوڑ دیا)

ظاہر ہے یہاں مخذول سے مراد یہودی قوم ہے لیکن چوں کہ حضرت مسیح ان کے نمائندہ

اور ترجمان تھے اس لیے انہوں نے ان کے بجائے اپنا ہی نام لیا۔

التفات:

قرآن عربی خطابت کا ایک اعلیٰ اور بے مثل نمونہ ہے اس میں زور بیان کے ساتھ مخاطب کی نفسیات اور مواقع کلام کی رعایت پوری طرح موجود ہوتی ہے، یہ نوع انسانی کے ایک ایک فرد کو خطاب کرتا ہے اور ایک ایک دل و دماغ کے پردے پر دستک دیتا ہے، یہ عوام الناس کو انداز و تبشیر کر رہا ہوتا ہے کہ یک بیک پہلو بدل کر مکذبین کو ان کے انجام کی دھمکی بھی دے دیتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین اور دلجوئی کا سامان مہیا کر رہا ہوتا ہے کہ بیچ ہی میں کفار و مشرکین کی شہ رگ کو جا پکڑتا ہے اور یہی بہترین خطابت کی علامت بھی ہے، اسی کو التفات کہا جاتا ہے۔ (۸۸)

یہ اسلوب عربی ادب میں بہت معروف ہے کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں مثال کے طور پر جریر بن عطیہ خطیفی حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مدح کرتے کرتے درمیان میں التفات کا یہ اسلوب استعمال کرتا ہے اور کہتا ہے:

أَتُنْسِيْ إِذْ تُوَدِّعُنَا سُلَيْمِيْ بَفِرْعَ بَشَامَةَ سُقِيْ الْبِشَامِ (۸۹)

(کیا تم بھول رہے ہو جب کہ سلیمی ہمیں فرع بشامہ پر الوداع کر رہی تھی بشام (ایک خوشبو

دار اور خوش ذائقہ درخت جس کو مسواک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے) سرسبز و

شاداب رہے)

اسی کا ایک دوسرا شعر ہے:

متیٰ كَانَ الْخِيَامُ بِذِي طُلُوحٍ سُقِيَتِ الْغَيْثُ أَيُّهَا الْخِيَامُ (۹۰)

(مقام ذی طلوح میں خیمے کب نصب تھے؟ اے خیمو! بارش کی وجہ سے تمہیں سرسبزی و

ہریالی نصیب ہو)

اس شعر میں سُقِيَتِ الْغَيْثُ التفات ہے۔

ایک اور موقع پر یہی شاعر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مرثیہ کہتے ہوئے بیچ میں حمام کی

طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اسے یوں دُعا دیتا ہے:

طَرِبَ الْحَمَامُ بِذِي الْأَرَاكِ فَهَا جَنِي لَا زَلْتَ فِي غَلِيٍّ وَ أَيْكَ نَاضِرٍ (۹۱)

(اراک پر بیٹھی ہوئی کبوتری چھپا اٹھی اور اس نے مجھے برا بیچتے کر دیا، اے حمام! خدا کرے

تو ہمیشہ رواں درواں نہر اور تروتازہ گھنی جھاڑیوں والے درخت پر بسیرا کرے)

قرآن نے اس اسلوب کو بکثرت استعمال کیا ہے مثال کے طور پر سورہ نحل میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ۔

(اے نبی! ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم وحی

کرتے ہیں)

پھر وہ انسانوں کی جانب متوجہ ہو کر فرماتا ہے:

فَأَسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (نحل: ۴۳)

(تو اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے)

پھر وہ نبی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کہتا ہے:

وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

(نحل: ۴۴)

(اور ہم نے تم پر بھی یاد دہانی اتاری تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دو جو

ان کی طرف اتاری گئی ہے اور تاکہ وہ غور کریں۔ (۹۲)

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ گو سارا قرآن وحی الہی ہے لیکن سب کا سب اللہ ہی کی

زبان سے ادا نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں ایسی دعائیں بھی ہیں جو خدا نے اپنے بندوں کو سکھائی

ہیں۔ (۹۳) اسی طرح اس میں مؤمنین، کافرین، ملائکہ اور عام انسانوں کے اقوال کی حکایت بھی

موجود ہے۔ اگر حکایت صراحت کے ساتھ ہوتی ہے تو اسے سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی لیکن بسا اوقات تصریح نہ ہونے کی وجہ سے دقت پیش آتی ہے ایسی صورت میں خطاب کرنے والے کی تعین موقع کلام اور حسن تاویل سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جن آیتوں میں خدا کے علاوہ دوسروں کا خطاب مذکور ہے ان کی بعض مثالیں درج ذیل ہیں:

وَمَا نَنْزِلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَلِكَ
وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا (مریم: ۶۴)

”اور ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے، ہمارے آگے اور پیچھے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب اسی کے اختیار میں ہے اور آپ کا رب کسی کو بھولنے والا نہیں ہے۔“
اسی طرح سورہ صافات میں ہے:

وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُونَ وَإِنَّا لَنَحْنُ
الْمُسَبِّحُونَ۔ (۱۶۴-۱۶۶)

”اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک معین مقام ہے اور ہم تو خدا کے حضور میں صف بستہ رہنے والے ہیں اور ہم تو اس کی تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔“

ظاہر ہے یہ باتیں فرشتوں کے گل سرسبد حضرت جبریلؑ کی زبان سے کہلوائی گئی ہیں۔ جو لوگ فرشتوں کے شریک خدا ہونے کے وہم میں مبتلا تھے ان کے وہم پر ضرب لگانے کے لیے سب سے زیادہ مؤثر چیز یہی ہو سکتی تھی کہ خود حضرت جبریلؑ ان کے آگے اپنی اور پورے زمرة ملائکہ کی حیثیت واضح کر دیں۔ اب اگر ان آیات کو اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے تو کتنی بڑی غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے اور خدا کی عظمت پر بری طرح حرف آنے لگتا ہے۔

التفات کے فوائد:

قرآن میں التفات کی مثالیں بے شمار ہیں اس کا یہ فائدہ بالکل عام ہے کہ اس کے ذریعہ مخاطب یا سامع کو ہوشیار اور خبردار کیا جاتا ہے کیوں کہ انسان عام طور سے غفلت اور جمود کا شکار ہوتا ہے۔ بہت سے واقعات اور دلائل آنکھوں کے سامنے سے گذرتے ہیں لیکن وہ ان سے کوئی سبق نہیں لیتا۔ یہ اس کی مالوف عادت ہے۔ اسی لیے التفات کا استعمال اکثر جمود و تعطل کی فضا کو درہم برہم کرنے اور انسان کو فکر و نظر کا عادی بنانے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے دوسرے فوائد

حسب ذیل ہیں۔

۱۔ بعید کو قریب اور غائب کو حاضر بنانا تاکہ مقصود ذہن میں پوری طرح بیٹھ جائے۔
مثال کے طور پر وَ إِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ثُمَّ نُنْجِي
الَّذِينَ اتَّقَوْا وَ نَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا۔ (مریم: ۷۱-۷۲)

تم میں سے ہر ایک کو بہر حال اس میں داخل ہونا ہے یہ تیرے رب کے اوپر ایک طے شدہ
امر واجب ہے پھر ہم ان لوگوں کو نجات بخشیں گے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہو گا اور
اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کو اس میں اکڑوں بیٹھے چھوڑیں گے)

ان آیات سے پہلے کفار و منکرین کا تذکرہ تھا اور بصیغہ غائب ان سے وہی بات کہی گئی تھی جو
ان آیات میں خطاب کے اسلوب میں کہی گئی ہے اور خطاب کا یہ اسلوب شدت عتاب پر دلیل
ہے۔ ما قبل کی آیات ملاحظہ ہوں۔

وَ يَقُولُ الْإِنْسَانُ إِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا أَوْ لَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ
أَنَا خَلَقْتَهُ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ يَكُ شَيْئًا فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ ثُمَّ لَنَحْضِرَنَّهُمْ
حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَنِ
عِتِيًّا ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أُولَىٰ بِهَا صِلِيًّا۔ (مریم: ۶۲-۷۰)

”اور انسان کہتا ہے کہ کیا میں مر جاؤں گا تو زندہ کر کے نکالا جاؤں گا کیا یہ انسان اس بات کو
نہیں چیتتا کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا در آلِ حالیہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ پس تیرے رب کی
قسم، ہم ان کو بھی اور شیطانوں کو بھی اکٹھا کریں گے پھر ہم ان کو جہنم کے گرد اس طرح کریں گے
کہ وہ دوزانو بیٹھے ہوئے ہوں گے پھر ہم ہر گروہ میں سے ان کو چھانٹ کر الگ کریں گے جو خدائے
رحمان سے سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے رہے ہوں گے۔ پھر ہم ان لوگوں کے سب سے
زیادہ جاننے والے ہوں گے جو اس جہنم میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ سزاوار ہوں گے۔“

یہاں آپ غور کریں تو دیکھیں گے پہلے غائب کے صیغوں کے ذریعہ مجرموں کا حال بیان ہوا
ہے پھر انہی مجرموں کو خطاب کر کے اللہ نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر ایک کو بلا استثناء جہنم میں اترنا
ہے ساتھ ہی نبی کو اطمینان دلایا ہے کہ یہ امر بالکل قطعی اور طے شدہ ہے۔ اس کو تمہارے رب نے
اپنے اوپر لازم ٹھہرا لیا ہے۔ ایک دن تم اپنے دشمنوں کا یہ انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ (۹۴)

۲۔ التفات زور بیان کے اظہار کے لیے اور خطاب کو موثر اور موکد بنانے کے لیے بھی لایا جاتا ہے اس موقع پر مخاطب کے لیے سننا ضروری نہیں ہے بلکہ غیظ و غضب کے اظہار کے لیے اس اسلوب کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب فرعون غرقابی کے وقت پینترہ بازی کرنے لگا اور ناک رگڑ رگڑ کر اس حقیقت کا اعلان کرنے لگا جس کا نام سننا بھی اسے پہلے گوارا نہ تھا تو اللہ نے کلام کا رخ بدل کر اسے ڈانٹا۔

”الْأُنَّ وَ قَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ“ (یونس: ۹۱)

(کیا اب! حالاں کہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تم فساد برپا کرنے والوں میں سے تھے) یعنی اب مانے جب ماننے کا وقت گذر گیا، اب مسلم بننے کا اقرار کرتے ہو در آں حالیکہ ساری زندگی فساد میں گذری۔

رسول پاک ﷺ نے غزوہ بدر میں اصحاب قلب کو اسی انداز سے خطاب کیا تھا آپ نے مردوں کو خطاب کر کے فرمایا تھا:

یا أهل القلب یا عتبة ابن ربيعة و یا شیبہ بن ربيعة و یا امیة بن خلف و یا أباجهل بن هشام هل و جدتم ما وعدکم ربکم حقاً فانی قد وجدت ما وعدنی ربی حقاً۔ یا أهل قلب بئس عشیرة النبی کتم لنبیکم کذبتموننی و صدقنی الناس و أخرجتموننی و آوانی الناس و قاتلتموننی و نصرنی الناس۔ (۹۵)

(اے گڑھے والو! اے عتبہ بن ربیعہ! اے شیبہ بن ربیعہ اور اے امیہ بن خلف! اور اے ابو جہل بن ہشام! تمہارے پروردگار نے جو تم سے وعدہ کیا تھا کیا تم نے اسے سچا پایا؟ مجھ سے تو میرے پروردگار نے جو کچھ وعدہ کیا تھا میں نے سچا پایا! اے گڑھے والو! تم اپنے نبی کے لیے اس کی قوم کے برے ثابت ہوئے تم نے مجھے جھٹلایا دوسرے لوگوں نے میری تصدیق کی! تم نے مجھے گھر سے نکالا اور دوسرے لوگوں نے مجھے پناہ دی تم نے مجھ سے جنگ کی اور دوسرے لوگوں نے میری مدد کی!) یہاں آپ نے جن لوگوں سے خطاب فرمایا ہے وہ سب مردے ہیں۔ مقصد انہیں سنانا نہیں تھا بلکہ شدت غضب اور زور بیان کا اظہار مقصود تھا اس لیے آپ نے غائب کفار کو حاضر متصور کر کے خطاب فرمایا۔

۳۔ التفات کا تیسرا فائدہ زجر و توبیخ اور ملامت کرنا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ مریم

میں کفار و مشرکین کے کارناموں کو غائب کے صیغے سے اس لیے بیان کیا تاکہ اس کی ناگواری اور گھناؤنا پن واضح ہو جائے۔ کیوں کہ یہ حرکتیں خدائے واحد کے ساتھ انتہائی بے ادبی اور گستاخی پر مبنی ہیں لیکن معا بعد التفات کے ذریعہ حاضر کا صیغہ استعمال کیا کیوں کہ مقصد مشرکین کو ملامت کرنا اور انہیں متنبہ کرنا تھا:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا۔ (مریم: ۸۸-۸۹)

(اور کہتے ہیں کہ خدائے رحمان نے اولاد بنا رکھی ہے۔ یہ تم نے بہت سنگین بات کہی ہے)

۴۔ التفات کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مخاطب کی قدر و منزلت کا اقرار اور اس کے سامنے عاجزی و انکساری کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ فاتحہ میں آغاز میں غائبانہ انداز میں حمد و تقدیس کی جاتی ہے اس کی رحمانیت اور قدرت کے گن گائے جاتے ہیں۔ پھر خدا کو خطاب کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار ہوتا ہے اور آخر میں اس سے ہدایت کی توفیق اور غضب سے بچنے کی دعا ہوتی ہے:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ

أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ (فاتحہ: ۴-۷)

(ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت

بخش۔ ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے اپنا فضل فرمایا جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ)

امر و القیس اپنے معلقہ میں پہلے محبوبہ کا غائبانہ تعارف کراتا ہے۔ اس سے اپنے عشق و محبت

کی داستان بیان کرتا ہے، اس کی خوب صورتی اور نزاکت پر سردھنٹا ہے اور پھر کلام کا پہلو بدل کر

اسے براہ راست مخاطب کرتے ہوئے یوں حال دل سناتا ہے:

أَلَا رِبْ نَخْصِمُ فَيْكَ الْوَيْ رَدَدْتَهُ نَصِيحٍ عَلَيَّ تَعْدَالَهُ غَيْرِ مَوْتَلٍ (۹۶)

(تمہاری محبت کے تئیں جھگڑا کرنے والے کتنے ہی رقیبوں کو میں نے دھتکار دیا جو اپنی

توئخ میں خیر خواہ معلوم ہوتے تھے اور مجھ کو باز رکھنے میں کسی قسم کا کسر نہ اٹھا رکھتے تھے)

کعب بن زہیر سلمی کی وہ قصیدہ جو حضور اکرم ﷺ کی مدح و منقبت میں کہا گیا ہے اس

اسلوب کی بہترین مثال ہے۔ ابتداء کے ۸۳ اشعار میں وہ بصیغہ غائب حضور کی مدح کرتے ہیں اور

پھر بڑے پیار بھرے انداز میں کلام کا رخ موڑ کر کہتے ہیں:

أَنْبِئْتُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ أَوْ عَدَنِي وَالْعَفْوُ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ مَمْلُوءٌ
 مَهْلًا! هَذَا اللَّهُ الَّذِي أَعْطَاكَ نَافِلَةً الْقُرْآنَ فِيهَا مَوَاعِظٌ وَتَفْصِيلٌ
 لَا تَأْخُذْنِي بِأَقْوَالِ الْوَشَاةِ وَ لَمْ أَذْنِبْ وَإِنْ كَثُرَتْ فِي الْأَقَاوِيلِ (۹۷)

(مجھے بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول نے مجھ کو معاف کر دینے کا وعدہ کیا ہے اور عفو ہی اللہ کے رسول سے متوقع ہے۔

دیکھیے! اللہ نے آپ کو ہدایت دی۔ اس نے قرآن آپ کو دیا جس میں نصیحتیں ہیں، اور ہر چیز کی تفصیل موجود ہے۔

چغل خوروں کی باتوں میں آکر میرا محاسبہ نہ کیجیے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے چاہے میرے بارے میں کتنی ہی باتیں اڑ رہی ہوں)

۵۔ التفات کا ایک اہم فائدہ مخاطب کو تسلی دینا اور کچھ اہم حقیقتوں سے پردہ اٹھانا ہے مثال کے طور پر سورہ بقرہ کے آغاز میں آیت ۵ تک قرآن اور نبی پر ایمان لانے والوں کی صفات کا تذکرہ کرنے کے بعد آیت ۶ اور ۷ میں آنحضرت کو براہ راست خطاب کر کے کہا گیا:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْتَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ.
 خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَ
 لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (بقرہ: ۶-۷)

(جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے یکساں ہے ڈراویانہ ڈراؤ۔ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔)

ان آیتوں کا اصل مدعا پیغمبر کو صرف یہ خبر دینا نہیں ہے کہ فلاں گروہ کے لوگ خواہ ان کو ڈراویانہ ڈراؤ ایمان لانے والے نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں آیات ایک تو پیغمبر کے لیے تسکین و تسلی اور مخاطبین کے لیے سرزنش اور دھمکی بن کر آئی ہیں یعنی ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے انذار و تبلیغ میں کوئی خامی یا کسر نہیں ہے بلکہ اللہ کے دین کو جھٹلاتے جھٹلاتے یہ خود قانون الہی کی زد میں آکر اپنی ساری صلاحیتوں سے محروم ہو چکے ہیں۔

دوسرے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ ہدایت صرف اس شخص کو ملتی ہے جو

اپنی ان صلاحیتوں کو استعمال کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی قدرت کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام نہ لے تو چاہے وہ لاکھ سر مارے اسے ہدایت کی راہ کبھی نہیں مل سکتی۔

اسی طرح سورہ بقرہ میں آیات ۲۱ سے ۲۹ میں التفات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بنی اسماعیل کو خطاب کیا گیا ہے ذرا دیر کے لیے یہود سے صرف نظر کر کے عربوں کو اس بات کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ یہود کی حسد اور ان کے پھیلائے ہوئے شگوفوں اور وسوسہ اندازیوں کا شکار ہونے کے بجائے اس نعمت عظمیٰ قرآن کی قدر کریں اور اس سے ہدایت حاصل کریں ورنہ یہود کی فتنہ پردازیوں میں مبتلا ہو کر اگر انہوں نے قرآن کی نعمت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا تو وہ یاد رکھیں کہ اس کی سزا بڑی ہی سخت ہے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ: ۲۱)

(اے لوگو! بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو)

اسی طرح آیت ۷۴ تک یہود کو خطاب کرتے کرتے آیت ۷۵ میں خطاب کا رخ مسلمانوں کی طرف مڑ گیا اور انہیں مخاطب کر کے فرمایا:

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ
اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ - (بقرہ: ۷۵)

(کیا تم لوگ یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہاری بات مان لیں گے اور حال یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ اللہ کے کلام کو سنتا رہا ہے اور اس کو سمجھ چکنے کے بعد اس کی تحریف کرتا رہا ہے اور وہ جانتے ہیں)

اس التفات کے دو مقصد ہیں ایک تو مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا کہ وہ بنی اسرائیل کی مخالفت سے نہ بددل ہوں نہ اس پر متعجب کہ یہ پڑھے لکھے اور دین و شریعت کے عالم لوگ اس دعوت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ دوسرا مقصد مسلمانوں کو یہود کی بعض پس پردہ حرکات اور سازشوں سے آگاہ کرنا ہے تاکہ سادہ لوح مسلمان ان کے دام فریب کا شکار نہ ہوں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ مکرو فریب کا کاروبار ہے جو یہودی ایمان کے دعویٰ کے ساتھ چلا رہے ہیں۔

۹۔ قرآن و وصل

عطف کے ساتھ یا بغیر عطف کے دو الفاظ یا متصل جملوں کو ایک ساتھ لانا قرآن کہلاتا ہے۔ اس سے مختلف معانی اور متنوع مفاہیم کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جن میں چند ایک کی وضاحت ذیل میں کی جاتی ہے:

۱۔ قرآن کا اولین فائدہ دو متصل جملوں یا دو الفاظ کو معانی کے اعتبار سے ایک امر کلی میں شامل کرنا ہے۔ مثالوں سے اس کی وضاحت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ (رحمن: ۵-۶)

(سورج اور چاند ایک متعین مسافت پر سرگرم عمل ہیں اور ستارے اور درخت سجدہ ریز ہیں)

اس آیت کے دو اجزاء ہیں ایک الشمس والقمر بحسبان جس کا مفہوم یہ ہے کہ شمس و قمر ایک نظام کے پابند ہیں اور نظم و ضبط کے ساتھ اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ (۹۹) یعنی انہیں ایک لامتناہی قدرت نے اپنے قبضے میں جکڑ رکھا ہے اس سے یہ انحراف نہیں کر سکتے گویا یہ اس کی اطاعت و عبادت میں مصروف ہیں۔ دوسرے جز والنجم والشجر يسجدان میں بھی یہی بات کہی گئی ہے کہ ستارے اور درخت سجدہ ریز ہیں اس طرح عبادت اور سجدہ ریزی یہ امر کلی ہے جس میں دونوں جملوں کا مفہوم شامل ہے اور قرآن سے یہاں یہی فائدہ حاصل کیا گیا ہے۔ اس آیت میں شمس و قمر اور نجم کہہ کر عالم جمادات کی تسخیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور شجر سے عالم نباتات کی سرافگندگی کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ اس اسلوب کا دوسرا فائدہ تاکید و توضیح ہے اگر پہلے لفظ یا جملے میں کوئی ابہام یا اجمال ہو تو دوسرے لفظ یا جملے کے ذریعہ اس کی وضاحت کر دی جاتی ہے اور بات موکد ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔

وَاللَّهُ لَا يَحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ - (بقرہ: ۲۷۶)

(اللہ کسی ناشکرے حق تلفی کرنے والے انسان کو پسند نہیں کرتا)

اس آیت میں ”اِثِيمٍ“ کفار کی مزید وضاحت کے لیے ہے۔ کفار کے معنی ناشکرے کے ہیں اور اِثِيمٍ کے معنی دوسروں کے حقوق تلف کرنے والے کے ہیں۔ اوپر اللہ نے یہ بات فرمائی ہے کہ اللہ سود کو گھٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا۔ اِثِيمٍ کا لفظ اس بات کی وضاحت ہے کہ کبوں

اللہ تعالیٰ سود خور کے سرمایہ کو مٹائے گا۔ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کسی ناشکرے اور حق تلفی کرنے والے کو محبوب نہیں رکھتا۔ اسی سورہ کا ایک دوسرا ٹکڑا ہے:

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (بقرہ: ۲۵۵) (وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے)

علیٰ اور عظیم دونوں تقریباً ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں، (۱۰۰) لیکن ان کا ایک ساتھ تذکرہ خدا کی بلندی و عظمت کے ناپید اکنار ہونے کو بتاتا ہے یعنی اس کی ہستی بڑی ہی بلند اور بہت ہی عظیم ہے۔ اس کے علم اس کی قدرت اور اس کی وسعت کو اپنے محدود پیمانوں سے نہ ناپو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔ اسی طرح ”عزیز مقتدر“ ”عزیز جبار“ اور ”عزیز ذوالانتقام“ سب ایک دوسرے کی تاکید کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ ان تینوں مقامات میں سے ہر ایک اپنی حقیقت کے ساتھ محض مبالغہ کے لیے اور اس کی ہیبت و عظمت کا نقش دلوں پر قائم کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۳۔ قرآن کا ایک فائدہ دو مقابل معانی کی وضاحت بھی ہے۔ قرآن میں بار بار دو مقابل الفاظ ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں جن میں ایک ظاہر بین نگاہ فرق اور تفاوت محسوس کر سکتی ہے لیکن اس اسلوب کے ذریعہ دراصل دونوں کی باہمی قربت اور تعلق کو واضح کرنا ہوتا ہے مثال کے طور پر العزیز الغفار، العزیز الرحیم، العزیز الحکیم، العزیز العظیم وغیرہ کی صفات دیکھیے ان میں بظاہر بہت بعد ہے۔ کہاں اقتدار و حاکمیت کا تصور اور کہاں رحمت و حکمت اور علم کا تصور؟

لیکن قرآن میں یہ صفات ایک ساتھ اس لیے مستعمل ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اللہ کی ذات اگر ایک طرف متکبرین اور سرکش انسانوں کے لیے قہر و غضب کی علامت اور اقتدار و حاکمیت کی برق بے اماں ہے۔ جو ہر ظالم و جابر اور مفسد انسان کی متاع حیات کو خاکستر کر دیتی ہے تو دوسری طرف اس کی ذات رحمت و حکمت اور علم کے اوصاف سے متصف ہے۔ وہ اپنے نیک بندوں کے ساتھ رحمت و رافت کا معاملہ کرتا ہے۔ انہیں ہر طرح کی سہولتیں اور نوازشیں عطا کرتا ہے اور دنیا و آخرت میں انہیں پناہ اور حفاظت فراہم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی یہ صفت اپنے بندوں میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ سورہ فتح میں ان کی خصوصیت یوں بیان کرتا ہے:

أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ۔ (۲۹) (وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں)

یعنی ان کی تمام حمیت و عصبيت ایمان و اسلام پر قائم ہے۔ جو ایمان و اسلام میں ان کے شریک نہیں ہیں وہ ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہیں تو ان کے اندر انگلی دھنسانے کی کوئی گنجائش نہیں پائیں گے۔ برعکس اس کے اپنے شریک ایمان بھائیوں کے لیے وہ سراپا رحمت و شفقت ہیں۔

۱۰- حذف

حذف کا مطلب ہے کہ کلام کے ان غیر ضروری اجزاء کو نکال دیا جائے جن کے بغیر بھی وہ پوری طرح سمجھ میں آجائے۔ جو چیزیں قابل فہم ہوں انھیں اس اسلوب میں سامع کی وضاحت اور زود فہمی پر اعتماد کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ (۱۰۱) کلام افہام و تفہیم کا ذریعہ ہے اس لیے الفاظ اور جملے کم اور معانی وسیع ہوں تو ان کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ عبدالقاہر جرجانی نے حذف کو سحر سے مشابہ اسی وجہ سے قرار دیا ہے کہ اس میں ذکر کے مقابلے میں عدم ذکر فصیح ہوتا ہے۔ نطق کے مقابلے میں سکوت زیادہ مفید ہوتا ہے اور گویائی پر عدم گویائی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ (۱۰۲)

عربوں کی ذہانت و فطانت اور قدرت کلام مشہور ہے۔ وہ الحُرُّ یُکفِیہ الإِشَارَةُ کے عادی اور پابند تھے۔ ان کے نزدیک سب سے موثر اور بلیغ کلام وہ ہے جو ما قَلَّ و ما دَلَّ ہو اور جو کلام حشو و زوائد سے خالی نہ ہو اسے فصاحت و بلاغت کے معیار سے بہت فروتر سمجھتے تھے۔ اس طرح حذف ان کی فطری خصوصیات کا ایک لازمی جزو تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جواب شرط، جواب قسم وغیرہ بہت سے ان نحوی قواعد کو حذف کر دیا جسے قرینہ سے سمجھا جاسکتا ہو۔ اور چوں کہ قرآن پاک امرؤ القیس، عمرو بن کلثوم اور نابغہ ذبیانی جیسے شعراء اور قس بن ساجدہ جیسے بلند پایہ خطیبوں کی نکلسالی زبان میں نازل ہوا ہے اس لیے حذف کے وہ تمام مواقع اس میں موجود ہیں جو اہل عرب کے یہاں مستعمل تھے اس لیے قرآن کے ایجاز و اعجاز کا اندازہ کرنے کے لیے حذف کے اسلوب کو سمجھنا بھی ضروری ہے ورنہ ظاہر ہے کہ عام قاری یہ کیسے سمجھ سکے گا کہ قرآن کے اندر وہ کیا سحر ہے جس نے تمام فصیحوں اور بلیغوں کو ہمیشہ کے لیے عاجز و در ماندہ کر دیا۔

مواقع حذف:

حذف کے بہت سے مواقع ہیں۔ ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

۱- مضارع سے پہلے متصل ماضی کا حذف کر دینا مثلاً کان یفعل کی جگہ صرف یفعل

کا استعمال۔ کلام عرب میں اس کی نظیریں بہت ہیں۔ چند اشعار بطور مثال درج ذیل ہیں:
متیم بن نویرہ کہتا ہے: (۱۰۳)

تقول ابنة العمرى مالك بعد ما اراك قديما نائم الوجه أفرعا
(عمری کی صاحبزادی (غالباً شاعر کی بیوی مراد ہے) مجھ سے کہتی ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے
جب کہ پہلے میں تم کو تروتازہ اور بڑے بالوں والا جوان دیکھتی تھی)
یہاں أراك، كنت أراك کے معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن كنت حذف کر دیا گیا ہے۔
اسی طرح خدش بن زہیر بن ربیعہ کہتا ہے: (۱۰۴)

قفار و قد ترعى بها أم رافع مذ انبها بين الأسلّة والصخر
(اب وہ سارے مقامات صحراء میں تبدیل ہو چکے ہیں جب کہ ایک زمانہ وہ تھا جب ام رافع
کی وجہ سے چٹانوں اور چشموں کے درمیان علاقے محفوظ تھے)

یہاں و قد ترعى 'در اصل قد كانت ترعى' کے معنی میں ہے۔
اعشى بن بکر بن وائل کہتا ہے:

فلئن شطّ بي المزار لقد اضحى قليل الهموم ناعم بال (۱۰۵)
(اگر مجھ سے ملاقات دور ہو گئی تھی تو مجھے بھی اس کی کوئی پروا نہ تھی اور میں آسودہ حال تھا)
قطامی کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:

كانت منازل مناقد نحلّ بها حتى تغير دهر نحائن خبل (۱۰۶)
(یہ وہ مقامات تھے جہاں ہم قیام کیا کرتے تھے یہاں تک کہ مکار اور دھوکا باز زمانہ بدل گیا)
قد نحل بها اصل میں قد كنا نحل بها تھا۔ کنا کو حذف کر دیا گیا تھا۔
قرآن پاک میں اس اسلوب کی مثالیں دیکھیے:

فَلَا تَكُ فِي مَرِيَّةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَوْلَاءِ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاءُ هُمْ
مِنْ قَبْلُ (ہود: ۱۰۹)

(پس تم ان چیزوں سے شک میں نہ پڑو جن کو یہ پوجتے ہیں۔ یہ ان چیزوں کو نہیں پوجتے
مگر اس طرح جس طرح اس سے پہلے ان چیزوں کو ان کے باپ دادا پوجتے تھے)
اس آیت میں دیکھیے کما كان يعبد کے بجائے کما يعبد فرمایا۔ كان کو حذف کر دیا۔

اسی طرح سورہ زخرف میں ہے:

وَ كَمْ أَرْسَلْنَا مِنْ نَبِيِّ فِي الْأُولِينَ وَ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ
يَسْتَهْزِئُونَ۔ (زخرف: ۶-۷)

(اور ہم نے کتنے نبی بھیجے اگلوں میں اور نہیں آتا تھا کوئی نبی ان کے پاس مگر وہ اس کا مذاق
اڑاتے تھے)

اس میں و ما یاتہم دراصل و ما کان یاتہم تھا لیکن عربی اسلوب کے مطابق کان کو

حذف کر دیا۔

سورہ انعام میں ہے:

وَ كَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ (انعام: ۷۵)

(اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے اقتدار کا مشاہدہ کراتے تھے)

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نوری ابراہیم دراصل کُنَّا نُرِي إِبْرَاهِيمَ تھا۔ لیکن عام

اسلوب کے مطابق مضارع سے پہلے ”کُنَّا“ حذف کر دیا گیا ہے۔

سورہ بقرہ میں فرمایا:

قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ (بقرہ: ۱۲۲)

(ہم آسمان کی طرف تمہارے رخ کی گردش دیکھ رہے تھے)

یہاں قد نری دراصل قد کُنَّا نری ہے۔

سورہ ہود میں ہے:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَ وَحِينَا وَلَا تُخَاطِبُنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا

إِنَّهُمْ مُغْرَقُونَ وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ وَ كَلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ

سَخِرُوا مِنْهُ (ہود: ۳۷-۳۸)

(اور تم کشتی بناؤ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق اور ان ظالموں کے باب

میں اب ہم سے کچھ نہ کہو، یہ تو غرق ہو کر رہیں گے اور وہ کشتی بنانے لگا اور جب جب اس

کی قوم کے بڑوں کی کوئی جماعت اس کے پاس سے گذرتی تو اس کا مذاق اڑاتی)

یہاں بھی اسی معروف اسلوب کے مطابق يَصْنَعُ سے پہلے جَعَلَ فعل ماضی محذوف ہے۔

۲۔ عام طور سے مشابہ فعل کے بعد فعل محذوف ہو جاتا ہے کیوں کہ سامع قرآن سے سمجھ لیتا ہے۔ ابو عطاء السندی، ابن ہبیرہ کامرثیہ کہتے ہوئے نوحہ خوانی کرتا ہے:

عَشِيَّةَ قَامَ النَّائِحَاتُ وَشَقِقَتْ جِيوْبُ بَأَيْدِي مَاتِمٍ وَخَدُوْدُ (۱۰۷)

(اور وہ آنکھ بھی بخیل ہے جو اس رات کو نہ روئے جب کہ نوحہ کرنے والی عورتیں ماتم کے

لیے تیار ہو گئیں۔ ان کے گریبان تار تار ہو گئے اور رخسار طمانچوں سے لہو لہان ہو گئے)

یہاں اصل میں شَقِقَتْ جِيوْبُ و لَطَمَتْ خَدُوْدُ تھا لیکن لَطَمَتْ کو حذف کر دیا

کیوں کہ اس سے پہلے مشابہ فعل شَقِقَتْ موجود تھا جو محذوف پر دلالت کر رہا تھا۔

اس اسلوب کو قرآن نے بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ (حشر: ۹)

(اور جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ایمان لا کر دارالہجرت میں مقیم تھے)

یہاں پوری عبارت یوں تھی ”تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَ أَحْكَمُوا الْإِيْمَانَ“ (یعنی جنہوں نے پہلے

سے دارالہجرت میں اقامت اختیار کر رکھی ہے اور اپنے ایمان کو بھی مضبوط کر رکھا ہے) لیکن

أَحْكَمُوا کو حذف کر دیا گیا کیوں کہ قرینہ سے مفہوم سمجھ میں آرہا تھا۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن کہتا ہے:

وَأَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَ أَنْهَارًا وَ سُبُلًا لَعَلَّكُمْ

تَهْتَدُونَ (نحل: ۱۵)

(اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈال دیے ہیں کہ وہ تمہیں لے کر جھک نہ پڑے اور نہریں

جاری کر دی ہیں اور راستے نکال دیے ہیں تاکہ تم راہ پاؤ)

یہاں اصل عبارت یوں تھی فَجَرَّ فِيهَا أَنْهَارًا وَ مَدَّ فِيهَا سُبُلًا لیکن چون کہ یہ افعال بغیر

اظہار کے ظاہر تھے اور أَلْقَى ان محذوفات کی پروردہ کشائی کر رہا تھا اس لیے انہیں حذف کر دیا گیا۔

سورہ نساء میں ہے:

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَ لَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا۔ (۳۶)

(تم سب اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ

نیک برتاؤ کرو)

یعنی اَعْبُدُوا اللَّهَ وَاَحْسِنُوا بِالْوَالِدَيْنِ

ایک اور مقام پر قرآن کہتا ہے:

نَدُّعُ اَبْنَاءَنَا وَاَبْنَاءَكُمْ وَاَبْنَاءَنَا وَاَبْنَاءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ

ثُمَّ نَبْتَهِّلُ فَنَجْعَلُ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ (آل عمران: ۶۱)

(ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو جمع کریں تم اپنی عورتوں

کو جمع کرو ہم اپنے آپ کو اکٹھا کریں تم اپنے آپ کو اکٹھا کرو، پھر ہم مل کر دعا کریں اور

جھوٹوں پر لعنت بھیجیں)

اس آیت میں محذوفات کو اگر کھول دیا جائے تو پوری آیت یوں ہوگی: نَدُّعُ نَحْنُ اَبْنَاءَنَا

نَا وَاَنْتُمْ اَبْنَاءَكُمْ وَاَنْتُمْ اَبْنَاءَنَا وَاَنْتُمْ اَبْنَاءَكُمْ وَاَنْتُمْ اَبْنَاءَنَا وَاَنْتُمْ اَبْنَاءَكُمْ وَاَنْتُمْ اَبْنَاءَنَا وَاَنْتُمْ اَبْنَاءَكُمْ

۳۔ جواب شرط یا جزاء اکثر حذف ہو جاتی ہے۔ خاص طور سے جب دلائل کا تذکرہ ہو۔

مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار کا مطالعہ کیجیے:

عباس بن مرداس کہتا ہے:

فَانَاكَ فِي شَرَارِكُمْ قَلِيلًا فَانِي فِي خِيَارِكُمْ كَثِيرًا (۱۰۸)

(اگر میں تمہارے بروں کی نگاہ میں کمتر ہوں تو کوئی پروا نہیں کیوں کہ میرا ان سے کوئی

تعلق نہیں ہے میں تمہارے اچھے لوگوں کی نگاہ میں با وقعت ہوں کیوں کہ میں انھیں

میں شمار ہوتا ہوں)

یہاں اصل عبارت محذوفات کو کھولنے کے بعد یوں بنے گی۔ فَاَنَا فِي شَرَارِكُمْ

قَلِيلًا فَلَا أُبَالِي بِهِ لَأَنِّي لَسْتُ مِنْهُمْ فَانِي فِي خِيَارِكُمْ كَثِيرًا فَانِي مِنْهُمْ

ایک دوسرا جاہلی شاعر تابط شرّا کہتا ہے:

فَلَنُ فَلَ هَذِيلُ شِبَاهُ بَمَا كَانَ هَذِيلًا يُفْلُ (۱۰۹)

(اگر آج ہذیل کے ہتھیار کند ہو گئے ہیں تو کوئی افسوس کی بات نہیں ہے کیوں کہ یہ ہذیل

تھا جو دوسروں کے ہتھیاروں کو کند بنا دیا کرتا تھا)

اصل عبارت یوں تھی فَلَنُ فَلَ هَذِيلُ شِبَاهُ فَلَا أَسْفَى عَلَيْهِ لَأَنَّهُ كَانَ هَذِيلًا يُفْلُ

قرآن پاک میں اس سلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ یہاں چند مثالیں نقل کی جا رہی ہیں:

سورہ زمر میں فرمایا:

إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ (زمر: ۷)
(اگر تم ناشکری کرو گے تو خدا تم سے بے نیاز ہے)

یہاں جزا محذوف ہے اصل عبارت یوں ہے۔ إِنْ تَكْفُرُوا فَلَنْ تَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا لَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ یعنی اگر تم دوسروں کو خدا کا شریک بنا کر ناشکری کر رہے ہو تو خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اس لیے کہ وہ تمہارے کفر و شرک سے بے نیاز ہے۔ وہ تمہارا محتاج نہیں بلکہ تم اس کے محتاج ہو۔

یہی مفہوم سورہ آل عمران میں اس طرح بیان ہوا ہے:

وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا (آل عمران: ۱۷۴)
(اور جو پیٹھ پیچھے پھر جائے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا)

سورہ زمر ہی کی آیت ہے:

أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِنْ رَبِّهِ فَوَيْلٌ
لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ أُولَئِكَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ - (زمر: ۲۲)
(کیا وہ جن کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے پس وہ اپنے رب کی طرف سے
روشنی پر ہیں (اور وہ جن کے دل سخت ہو چکے ہیں یکساں ہوں گے؟) تو ہلاکی ہے ان کے
لیے جن کے دل اللہ کی یاد دہانی قبول کرنے کے معاملے میں سخت ہو چکے ہیں! یہی لوگ
کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں)

یہاں اگر محذوف کو کھول دیا جائے تو عربی عبارت یوں بنے گی أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ
صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِنْ رَبِّهِ يَسْتَوِي مَنْ قَسَى قَلْبَهُ فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ
قُلُوبُهُمْ۔ جزا حذف ہو گئی ہے۔

اس مفہوم کی وضاحت اسی سورہ میں پیچھے آچکی ہے۔ فرمایا:

فَهَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولَئِكَ الْأَلْبَابِ (۹)
(پس کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے ہیں برابر ہو جائیں گے۔ تذکر تو صرف
عقل والے حاصل کرتے ہیں)

سورہ فاطر میں ہے:

وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ (فاطر: ۴)

(اور اگر تمہیں جھٹلاتے ہیں تو کچھ غم نہ کرو، تم سے پہلے بھی کتنے رسولوں کی تکذیب کی گئی ہے)

یہاں محذوف کو کھول دینے کے بعد اصل عبارت یوں ہوگی وَ إِنْ يُكْذِبُوكَ فَلَا تَحْزَنَ لَآنَهٗ قَدْ كَذَّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ سر پھرے تمہاری تکذیب کر رہے ہیں تو یہ کوئی تعجب یا غم کی بات نہیں ہے۔ تم سے پہلے جو رسول آئے ان کی بھی تکذیب کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں تمہاری کسی کوتاہی کو دخل نہیں ہے بلکہ تمام تردخل ان مکذبین کی مخصوص ذہنیت کا ہے۔

سورہ تحریم میں ہے:

وَإِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ

هُوَ مَوْلَاةٌ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ (۴)

(اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی تمہارے لیے زیبا ہے۔ تمہارے دل تو خدا

کی طرف مائل ہی ہیں (۱۱۰) اور اگر تم اس کے خلاف ایکا کرو گی تو اس کا حامی اللہ ہے

جبریل اور نیکوکار مسلمان اس کے ساتھ ہیں)

یہاں محذوف کو کھول دیا جائے تو اصل عبارت یوں ہوگی۔ وَ إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَهَذَا

أَجْدَىٰ بِكُمْ لَآنَهٗ قَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَ إِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَلَا يَضُرُّكَ لِأَنَّ اللَّهَ

هُوَ مَوْلَاةٌ۔ یعنی تم اگر اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی بات تمہارے شایان شان ہے اس لیے کہ

تمہارے دل تو اللہ کی طرف جھکے ہوئے ہیں اور اگر تم نے رسول کے خلاف محاذ بنایا تو یاد رکھو کہ

رسول اپنی دلجمعی کے لیے تمہارا محتاج نہیں بلکہ اس کی طمانیت کے لیے اللہ، جبریل اور مؤمنین

صالحین کی معیت و رفاقت کافی ہے۔

سورہ نساء میں فرمایا:

وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا (نساء: ۱۲۷)

(اور جو مزید بھلائی تم کرو گے تو اللہ اس سے باخبر ہے)

عبارت کھول دی جائے تو یوں ہوگی وَ مَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ فَان

اللَّهُ كَانَ بِهِ عَلِيمًا یعنی جو کچھ بھی نیکی تم کرو گے اللہ کے یہاں اس کا بھرپور بدلہ پاؤ گے

کیوں کہ وہ ہر ایک کے عمل کی خبر رکھتا ہے۔

۴۔ اگر قرینہ موجود ہو تو شرط اور جواب شرط کا ایک ساتھ حذف کر دینا۔ مثال کے طور پر سورہ نساء میں فرمایا:

أَيْتَّغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا (نساء: ۱۳۹)

(کیا یہ لوگ ان کے یہاں عزت و رسوخ چاہتے ہیں۔ عزت تو سراسر اللہ کے لیے ہے)

پوری عبارت یوں ہے أَيْتَّغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ إِنْ يَتَّغُوا الْعِزَّةَ عِنْدَهُمْ لَنْ يَجِدُوهَا فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا۔ یعنی کیا یہ منافق یہودیوں کے یہاں عزت و سرخروئی حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں؟ اگر یہ یہود کے یہاں عزت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تو انہیں مایوسی ہوگی کیوں کہ عزت و ذلت سب خدا کے اختیار میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔

یہاں قرینہ کی موجودگی میں شرط اور جواب شرط دونوں محذوف ہو گئے ہیں۔

۵۔ اگر تکرار سے عیب پیدا ہو رہا ہو تو اس مکرر لفظ کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے

طور پر مندرجہ ذیل آیات کا مطالعہ کیجیے:

فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (انفال: ۶۶)

(اگر تمہارے سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو

اللہ کے حکم سے دو ہزار پر بھاری ہوں گے اور اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے)

اس آیت میں وان یکن منکم اصل میں ألف صابرٌ تھا پہلے جملے میں صابرة کا تذکرہ

ہو چکنے کے بعد اس کو یہاں دوبارہ نہیں لایا گیا بلکہ آگے واللہ مع الصابرين کہہ کر اس کی وضاحت کر دی گئی۔

اسی طرح سورہ بقرہ میں فرمایا:

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى (بقرہ: ۱۹۷)

یہاں اصل میں وَتَزَوَّدُوا التَّقْوَى تھا یعنی سفر حج کے لیے نکلو تو تقویٰ کا زاد راہ لے کر نکلو

کیوں کہ بہرین زاد راہ تقویٰ ہے۔ پہلی جگہ بلاغت کے تقاضے کے تحت تقویٰ کے لفظ کو حذف

کر دیا اس لیے کہ آگے اس کا اظہار ضروری تھا اگر پہلے مقام میں اس کا اظہار کر دیا جاتا تو اس میں تکرار کا عیب پیدا ہو جاتا۔

۶۔ بل سے پہلے انکار یہ جملہ حذف کر دیا جاتا ہے کیوں کہ بل خود ہی انکار پر دلالت

کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَابِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسَدُونَنَا
بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا (فتح: ۱۵)

(کہہ دو تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے یہی بات تو اللہ نے تم کو پہلے بھی فرمائی تھی، تو وہ کہیں گے کہ بلکہ تم لوگ ہم پر حسد کرتے ہو بلکہ یہی لوگ بہت کم سمجھتے ہیں)

اس آیت میں بل تحسدوننا سے پہلے لم يقل الله اور بل كانوا لا يفقهون إلا

قليلاً سے پہلے لا يقولون بعلم محذوف ہے یعنی وہ لوگ کہیں گے کہ اللہ نے یہ باتیں نہیں کہی ہیں بلکہ تم لوگ خود حسد کرتے ہو اور دوسرے جملے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس طرح کی باتیں علم و استدلال کی روشنی میں نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ان کے پاس علم و شعور نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

۷۔ قرینہ موجود ہو تو معطوف علیہ حذف ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ آل عمران

میں فرمایا:

قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى
مَضَاجِعِهِمْ وَ لِيَبْتَليَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَ لِيُمَحِّصَ مَا فِي
قُلُوبِكُمْ (آل عمران: ۱۵۴)

(کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے جب بھی جن کا قتل ہونا مقدر تھا وہ اپنی قتل گاہوں تک پہنچ کر رہتے۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ تمہاری آزمائش کرے جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اسے پرکھے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو صاف کرے)

یہاں وَ لِيَبْتَليَ اللَّهُ کا معطوف علیہ ليمتحن المومنين محذوف ہے یعنی اللہ کے رسول

کے ہاتھوں انہیں جانی و مالی نقصان اس لیے ہوا تاکہ مومنین و منافقین کی آزمائش ہو سکے اہل ایمان کا درجہ بلند ہو اور منافقوں کے دلوں میں یہ حسرت کا کاٹھا بنے اور ان کی کمزوریاں ابھر کر سامنے آجائیں۔

۸۔ دو مقابل جملوں میں سے ہر ایک سے ایک یا چند الفاظ کا حذف کر دینا جب کہ اس کا مقابل محذوف کی طرف رہنمائی کر رہا ہو۔ مثال کے طور پر سورہ آل عمران میں فرمایا:

فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ أُخْرَى كَافِرَةٌ (آل عمران: ۱۳)

(ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا۔ دوسرا گروہ کافر تھا)

اگر اس آیت کے محذوفات کو کھول دیا جائے تو پوری عبارت یوں ہوگی! فِئَةٌ مُؤْمِنَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ أُخْرَى كَافِرَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فقرے کے پہلے حصے سے لفظ مومنة کو حذف کر دیا اور دوسرے میں تقاتل فی سبیل الطاغوت کو اس لیے کہ دوسرے میں کافرة کی صفت پہلے میں مومنة کی خبر دے رہی ہے اور پہلے میں فی سبیل اللہ کا حوالہ دوسرے میں فی سبیل الطاغوت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

سورہ نحل میں ہے:

فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ۔ (نحل: ۱۱۲)

(پس اللہ نے ان کو بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا)

اگر اس جملے کو کھولا جائے تو یوں ہوگا فَأَذَاقَهَا اللَّهُ طُعْمَ الْجُوعِ وَ أَلْبَسَهَا لِبَاسَ الْخَوْفِ۔ فقرہ کے آغاز سے لفظ ”طعم“ کو حذف کر دیا اور آخری فقرے سے فعل أَلْبَسَهَا کو کیوں کہ فعل اذاقها لفظ ”طعم“ کا پتادے رہا تھا اور لفظ لباس أَلْبَسَهَا کی ضرورت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ سورہ یونس میں ہے:

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا (یونس: ۶۷)

(وہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے تاریک بنایا تاکہ اس میں آرام کرو اور دن کو

روشن بنایا تاکہ تم اس میں معاش کے لیے جدوجہد کرو)

یہاں بھی محذوفات کو کھولنے کے بعد پورا جملہ اس طرح بنے گا: جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ مُظْلِمًا لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا لِتَبْتَغُوا فِيهِ فرمایا وہی خدا ہے جس نے تمہارے لیے شب کو تاریک اور خنک بنایا تاکہ اس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ اس میں کام کرو اور معاش کے لیے جدوجہد کرو۔

اس اسلوب کی کارفرمائی مندرجہ ذیل آیت میں بھی دیکھیے:

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (النباء: ۱۰-۱۱)

(اور رات کو تمہارے لیے پردہ اور دن کو وقت معاش بنایا)

اصل عبارت یوں ہے و جَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَ سَكُونًا وَ جَعَلْنَا النَّهَارَ ضِيَاءً وَ مَعَاشًا

سورہ ابراہیم میں ہے:

كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (ابراہیم: ۲۴)

(اس اچھی ذات کے درخت کی طرح جس کی جڑیں زمین میں گڑی ہوئی ہوں اور شاخیں

آسمان تک پہنچی ہوئی ہوں)

یہاں پہلے جملے میں ثابت کا لفظ ظاہر فرمایا تو دوسرے جملے میں فَرْعُهَا کے بعد اس کا

مقابل لفظ عال یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ حذف کر دیا اسی طرح دوسرے جملے میں فِي السَّمَاءِ کو

ظاہر فرمایا تو پہلے نکلے میں ثابت کے بعد فِي الْأَرْضِ حذف کر دیا۔ ان محذوفات کو کھولنے کے

بعد اس کا ترجمہ یہ ہو گا۔ اس کی جڑ زمین کی تہوں میں اتری ہوئی اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی

میں پھیلی ہوئی ہیں۔

سورہ انعام میں ہے:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَلَكُمْ (۳۸)

(زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو یہ سب

تمہاری ہی طرح کے انواع ہیں)

جملے کے پہلے حصہ میں فِي الْأَرْضِ کا لفظ دوسرے حصے کے محذوف فِي السَّمَاءِ کو کھول

رہا ہے اسی طرح دوسرے حصے کے يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ کے الفاظ پہلے حصے میں تَدْبُ عَلَى أَرْجُلِهَا

کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

سورہ نساء کی مندرجہ ذیل آیت دیکھیے:

مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ (۱۳۴)

(جو شخص دنیا کے صلے کا طلب گار ہے تو اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا صلہ موجود ہے)

اس آیت کے محذوفات کھول دیے جائیں تو کلام کی ترتیب یہ ہوگی۔ مَنْ كَانَ يُرِيدُ

ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الْآخِرَةِ فَعِنْدَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا

وَالْآخِرَةِ . یعنی جو شخص دنیا ہی کے صلے کا طالب ہوتا ہے تو دنیا کا مالک خدا ہی ہے وہ اس میں جس کو جتنا چاہتا ہے دیتا ہے اور جو آخرت کا طالب ہوتا ہے تو اللہ اس کو دنیا میں بھی جو چاہتا ہے دیتا ہے اور اسے آخرت کا صلہ بھی بھر پور عطا فرمائے گا۔ یہاں پہلے ٹکڑے سے فعند اللہ ثواب الدنيا کو اور دوسرے میں سے من كان يريد ثواب الآخرة کو حذف کر دیا ہے کیوں کہ دونوں ٹکڑوں کے مذکورہ جملے محذوف کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

کلام عرب میں اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ چند اشعار درج ہیں:
حارث بن حلزہ کہتا ہے:

وَالْعَيْشُ خَيْرٌ فِي ظِلَالِ النُّوكِ مِمَّنْ عَاشَ كَدًّا (۱۱۲)

(جماعت کے سارے میں آرام دہ زندگی اس سخت کوشش زندگی سے بہتر ہے جو عقل و دانش کے سارے میں بسر ہو)

اصل عبارت یوں ہے العيش في الرفاهية مع الحمق خير من العيش في الكد مع العقل پہلے حصے سے في الرفاهية کو اور دوسرے حصے سے مع العقل کو حذف کر دیا کیوں کہ کد اپنے بالمقابل لفظ ”رفاهية“ کو اور ”نوك“ عقل کو بتا رہا تھا۔
عمرو بن معدی کرب زبیدی کہتا ہے:

ليس الجمال بمئزر فاعلم و ان رُدِّيتَ بُرْدًا (۱۱۳)

(خوبصورتی لباس سے نہیں آتی چاہے یمنی شال ہی آپ پہن لیں)

یعنی محذوف کو کھول دینے کے بعد عبارت اس طرح ہوگی ليس الجمال ببرد و مئزر و ان رُدِّيتَ و اَنْزَرْتَ .

۹۔ حرف جر کے متعلق فعل کو حذف کر دیا جاتا ہے اور حرف جر اس مقدر پر دلالت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کی مندرجہ ذیل آیات دیکھیں:

حَقِيقٌ عَلَىٰ أَلَّا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقُّ (اعراف: ۱۰۵)

(میں سزاوار اور حریص ہوں کہ اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی اور بات منسوب نہ کروں)

یہاں تضمین ہے اصل عبارت تھی حقیق و حریصٌ عَلَىٰ أَلَّا أَقُولَ اس طرح گویا اصل

مفہوم کے اندر ایک اور اضافہ ہو گیا جس کی صراحت ترجمہ میں ہو گئی ہے۔ یہاں علی حرف جر بتا رہا

ہے کہ حریصٌ محذوف ہے کیوں کہ حَقِيقٌ کے ساتھ علی کا استعمال نہیں ہوتا۔

اسی سورہ کی ایک دوسری آیت ہے:

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَ مَلَائِهِ فَظَلَمُوا بِهَا (۱۰۳)

(پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان کے

پاس رسول بنا کر بھیجا تو انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم اور نشانیوں کا انکار کیا)

قرآن میں ظَلَمُوا کے ساتھ جہاں جہاں ”ب“ کا صلہ آیا ہے وہاں یہ لفظ كَفَرُوا اور

جَحَدُوا وغیرہ کے معنی پر متضمن ہے یعنی انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اللہ کی آیات کا انکار کر دیا۔ یہاں ترجمہ میں یہ مضمّر مضمون کھول دیا گیا ہے۔

سورہ طلاق میں ہے:

وَ كَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا وَ عَذَّبْنَاهَا نَذَابًا نُكْرًا (طلاق : ۸)

(اور کتنی ہی بستیاں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اپنے رب کے حکم اور اس کے رسولوں سے

سرکشی کی تو ہم نے ان کا سخت محاسبہ کیا اور ان کو نہایت ہولناک عذاب دیا)

یہاں عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا میں ”عن“ اس امر کا قرینہ ہے کہ یہاں عَتَتْ أَعْرَضَتْ

کے مفہوم پر متضمن ہے اور پوری عبارت یوں ہے وَ كَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ وَ أَعْرَضَتْ عَنْ أَمْرِ

رَبِّهَا یعنی سرکشی کے سبب سے انھوں نے اپنے رب کے حکم سے اعراض کیا تو ہم نے ان کی سخت

گرفت کی اور انھیں ہولناک عذاب کا لقمہ بنا دیا۔

عربی ادب میں یہ اسلوب بہت مانوس ہے ایک حماسی شاعر کہتا ہے: (۱۱۲)

عجبت لمسراها و أنى تخلصت إلى و باب السجن دونى مغلقة

(میں اس کی آمد پر متحیر ہوا اٹھا لیکن وہ جیل کے دروازے سے گذر کر مجھ تک کیسے پہنچ

سکتی ہے جب کہ قید خانے کے دروازے بند ہیں)

یہاں تخلصت الیّ اس امر کا قرینہ ہے کہ تخلصت یہاں وَصَلَتْ کے مفہوم پر

متضمن ہے یہاں اصل عبارت یوں ہے انى تخلصت من باب السجن و وصلت إلى .

حضرت حسان بن ثابت کہتے ہیں:

هُمُ جِبِلُّ الْإِسْلَامِ وَالنَّاسِ حَوْلَهُ رَضَامُ إِلَى طُودِ يَرُوقُ وَيَقْهَرُ (۱۱۵)

(یہ لوگ اسلام کے پہاڑ تھے اور ان کے ارد گرد رہنے والے لوگ پتھر تھے جو ایک ایسے

ٹیلے کا سہارا لیے ہوئے تھے جو جمال و رعنائی کا پیکر تھا اور جلال و شکوہ کا مجسمہ بھی تھا)

یہاں رَضَامُ إِلَى طُودِ میں رَضَامُ کے بعد مسندۃً محذوف ہے جس پر حرف جِ رالی

دلالت کر رہا ہے چوں کہ وہ قرینہ سے سمجھا جا رہا تھا اس لیے تقاضائے بلاغت کے تحت اسے حذف کر دیا گیا۔

۱۰۔ قرینہ موجود ہو تو جواب قسم عذف ہو جاتا ہے۔ سورہ ق میں ہے:

ق وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ بَلْ عَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ فَقَالَ الْكَاْفِرُونَ هَذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ (ق: ۱-۲)

(یہ سورہ ق ہے۔ قسم ہے باعظمت قرآن کی بلکہ ان لوگوں کو تعجب ہوا کہ ان کے پاس انھیں

کے اندر سے ایک آگاہ کرنے والا آیا تو کافروں نے کہا کہ یہ تو ایک نہایت عجیب بات ہے)

یہاں جواب قسم قرآن مجید کی صفت کے اندر مضمحل ہے لیکن محذوف ہے۔ پوری عبارت

یوں ہے ق وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ إِنَّهُ لَحَقُّ لِعَنِي جَو لُوكِ قُرْآنِ كِے انذار قیامت کو یہ بہانہ بنا کر نظر

انداز کر رہے ہیں کہ یہ وحی الہی نہیں بلکہ وحی شیطانی ہے۔ ان کی تردید کے لیے قرآن مجید کی

معجزانہ بلاغت ہی کافی ہے۔ یہ کتاب خود شہادت دیتی ہے کہ یہ وحی الہی ہے اس کے لیے کسی خارجی

دلیل کا لانا اس کی حقانیت اور بدیہیت پر پردہ ڈالنا ہے۔ یہ لوگ قرآن کے اس وجہ سے منکر ہیں کہ

ان کی نظر میں یہ بات عجیب ہے کہ اس کی خبر دینے والا انھیں کے اندر کا ایک آدمی ہے۔

سورہ ص میں ہے:

ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ (ص: ۱-۲)

(یہ سورہ ص ہے۔ قسم ہے یاد دہانی سے معمور قرآن کی (کہ اس کی ہر بات حق ہے) بلکہ

جن لوگوں نے اس کا انکار کیا وہی گھمنڈ اور مخالفت میں مبتلا ہیں)

یہاں جواب قسم جو مقسم بہ کی صفت میں مذکور ہے محذوف ہے یعنی قرآن جن آیتوں سے

مزین ہے اور اس میں جس قسم کی یاد دہانی موجود ہے وہ اس بات پر شاہد ہے کہ آج قریش کو جن

باتوں کی تذکیر کی جارہی ہے وہ بالکل ناقابل انکار ہیں اگر وہ ان کو نہیں مان رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ قرآن کے اندر کسی ریب و شک کی گنجائش ہے بلکہ اس کا سبب محض ان کی انانیت اور مخاصمت ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ جہاں کہیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ مخاطب ہو شیار ہو کر انکار کا ترکش سنبھالے گا وہاں جواب قسم کو حذف کر دیا جاتا ہے اور صرف مقسم بہ پر اکتفا کر کے اس کے بعد کوئی ایسی بات لائی جاتی ہے جو محذوف پر دلیل ہوتا کہ مخاطب کو اتنی فرصت ہی نہ ملے کہ وہ انشاء کو خبر کی صورت میں ڈھال کر اس کی تردید و انکار کے لیے آمادہ ہو اس کی مثال اوپر کی دونوں آیات ہیں۔

سورہ فجر میں ہے:

وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ وَاللَّيْلِ إِذَا يَسِرَ (فجر: ۱-۴)

(قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت و طاق کی اور رات کی جب وہ رخصت ہو رہی ہو)

اس کے بعد إِنَّ الدین لواقع جواب قسم محذوف ہے یعنی یہ صبح کا پو پھٹنا، آخری دس راتوں میں چاند کا دھیرے دھیرے باریک سے باریک تر ہو جانا پھر پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہونا اور جفت و طاق مہینے کے ایام سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایک دن حساب کا ضرور آئے گا۔ سورہ نازعات میں دیکھیے:

وَالنَّازِعَاتِ غَرْقًا وَالنَّاشِطَاتِ نَشْطًا وَالسَّبِحاتِ سَبْحًا فَالسَّبِقتِ

سَبْقًا فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا۔ (۱-۵)

(قسم ہے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے والی ہواؤں کی اور قسم ہے آہستہ چلنے والی ہواؤں کی اور قسم ہے

فضاؤں میں تیرنے والے بادلوں کی پھر ایک دوسرے پر سبقت کرنے والے اور خدا کے حکم

نازل کرنے والے بادلوں کی، کہ جس چیز سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے شدنی ہے)

یہاں بھی جواب قسم محذوف ہے اگر اسے کھول دیں تو اوپر کے جملوں کے بعد إِنَّمَّا

تُوْعَدُونَ لَوَاقِعِ جواب مذکور ہو گا گویا تند اور نرم ہواؤں اور بادلوں کے عجائب تصرفات کو شہادت

میں پیش کر کے قریش کو آگاہ کیا گیا ہے کہ تمہیں عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے اس کو ناممکن نہ سمجھو۔

۱۱۔ کبھی کبھی جواب قسم سے پہلے لَا حَذَفَ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ یوسف میں ہے:

وَاللّٰهُ تَفْتًا تَذَكُّرُ يُوسُفَ حَتَّى تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنْ
الْهَالِكِينَ (یوسف: ۸۵)

(بخدا آپ یوسف ہی کی یاد میں رہیں گے یہاں تک کہ ازکار رفتہ ہو کے رہ جائیں گے یا
ہلاک ہی ہو جائیں گے)

یہاں تفتاً اصل میں لَا تَفْتًا تھا لَا حذف ہو گیا ہے۔

عربی شاعری میں یہ اسلوب بہت استعمال ہوا ہے۔ امرء القیس کہتا ہے:

فقلت يمين الله أبرح قاعدًا ولو قطعوا راسي لديك و أوصالي (۱۱۲)
(میں نے کہا بخدا میں تیرے حضور موجود رہوں گا چاہے لوگ میرا سر تن سے جدا
کر دیں اور میرے عضو عضو الگ کر دیں)

یہاں أبرح اصل میں لا أبرح تھا۔ اسی اسلوب کے مطابق لَا حذف ہو گیا ہے۔
حضرت حسان بن ثابتؓ کا شعر ہے:

وَاللّٰهُ أَسْمَعُ مَا بَقِيَتْ بِهَالِكٍ إِلَّا بِكَيْتُ عَلَى النّبِيِّ مُحَمَّدٍ (۱۱۷)
(بخدا میں اپنی زندگی میں جب بھی کسی مرنے والے کا تذکرہ سنوں گا محمد ﷺ کی وفات
پر آنسو بہانا میرے لیے ضروری ہوگا)

یہاں دراصل وَاللّٰهُ لَا أَسْمَعُ تھا لیکن قسم کے بعد لَا حذف ہو گیا ہے۔

۱۲۔ اگر دو جملے ایک دوسرے کی وضاحت کے لیے آئیں اور دونوں نہیں پر مشتمل ہوں
تو دوسرے جملے سے لَا کو حذف کر دیتے ہیں دونوں ہی جملوں میں ایک ہی حقیقت کو ظاہر کرنا ہوتا
ہے۔ پہلی بات کے بعد دوسری بات محض ایک بیان اور وضاحت کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثال کے
طور پر قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات دیکھیے:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (بقرہ: ۴۲)

(اور حق اور باطل کو گڈ گڈ نہ کرو حق کو چھپانے کے لیے دریاں حالیکہ تم جانتے ہو)

چونکہ حق اور باطل کو گڈ گڈ کرنے کی کوشش سے حق کو چھپانا مقصود ہے اس لیے عطف کیا
اور وہ بھی بغیر لا کے، یہ بتانے کے لیے کہ یہود تلپیس کی جو پالیسی اپنائے ہوئے ہیں اس کا مقصد
محض کتمان حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے پہلے حق و باطل کو گڈ گڈ کرنے سے روکا جو

در حقیقت حق و باطل کے التباس کی کوشش کا اصل مقصود و مدعا تھا۔

اسی سورہ میں آگے فرمایا:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالِكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تَذُلُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ (بقرہ: ۱۸۸)

(اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ اور نہ اس کو حکام رسی کا

ذریعہ بناؤ)

اصل میں وَلَا تَذُلُّوا بِهَا تھا لیکن چوں کہ دوسرا فقرہ پہلے فقرے کی وضاحت کر رہا ہے

اس لیے صرف لا کے اعادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

اسی طرح سورہ انفال میں ہے:

وَلَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَ تَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ

(انفال: ۲۷)

(اللہ اور رسول سے بے وفائی اور اپنی امانتوں میں خیانت جانتے بوجھتے نہ کرو)

یہاں بھی دوسرا جملہ پہلے جملے کے تحت ہے لیکن صرف نہی کا اعادہ نہیں فرمایا ہے جس سے

یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ اور رسول سے خیانت ہی ہے جو لوگوں کے لیے اپنی امانتوں اور ذمہ داریوں

میں خیانت کے لیے راہ کھولتی ہے۔

اسی طرح سورہ محمد میں دیکھیے:

فَلَا تَهِنُوا وَ تَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَ أَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ وَ اللَّهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ

يَتْرِكْكُمْ أَعْمَالَكُمْ (محمد: ۳۵)

(پس تم کمزور نہ پڑو اور سمجھوتے کی دعوت نہ دو اور تم ہی غالب رہو گے اور اللہ تمہارے

ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کے باب میں تمہارے ساتھ کوئی خیانت نہیں کرے گا)

یہاں معطوف اور معطوف علیہ دونوں میں ایک ہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے اس لیے لاء نہی

کے اعادہ کی ضرورت نہیں پڑی۔ منافقین چوں کہ جنگ کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے اور بزدل تھے اس

لیے صلح اور سمجھوتے کی باتیں بہت کرتے تھے اور جہاد و قتال سے گریز کرتے تھے۔ فرمایا کہ ان کی یہ

پالیسی تمام تر ان کی بزدلی اور مفاد پرستی پر مبنی ہے لیکن وہ اس کی دعوت صلح پسندی اور امن دوستی

کے روپ میں دیتے ہیں اسی وجہ سے تدعو کو فلا تهنوا پر عطف کر دیا اور لا کو حذف کر دیا تاکہ

اسلوب کلام ہی سے یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ دعوت صلح ان کی بزودی پر پردہ ڈالنے کی ایک ناکام سعی ہے۔ یہاں ایسے ہی منافقوں کی خبر لی گئی ہے اور انہیں ڈانٹا گیا ہے کہ بزودی نہ دکھاؤ، صلح اور سمجھوتے کے داعی نہ بنو بلکہ عزم و ایمان کے ساتھ جہاد کے لیے اٹھو اگر تم جہاد پر کمر بستہ ہو جاؤ گے تو تمہی سر بلند رہو گے۔

۱۳۔ کلام عرب میں جب کلام کا آغاز اِذ سے ہوتا ہے تو اس سے پہلے اُذْکُرْ یا اس کے ہم معنی کسی فعل کو حذف کر دیا جاتا ہے یعنی خیال کرو، تصور کرو، یاد کرو عموماً اس کے بعد کسی ایسی ہی سرگذشت یا واقعہ کا حوالہ آتا ہے جو یا تو مخاطب کے علم میں ہو یا خود متکلم اس کی قطعیت پر اس درجہ مطمئن ہو کہ ایک معلوم و معروف حقیقت کی حیثیت سے اس کا حوالہ دے سکے۔ مثال کے طور پر سورہ بقرہ میں فرمایا:

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً. (بقرہ: ۳۰)

(اور یاد کرو اس وقت کو جب تمہارے رب نے کہا فرشتوں سے کہ میں زمین میں ایک

نائب بنانے والا ہوں)

اصل عبارت یوں تھی وَ اِذْکُرُوْا اِذْ قَالَ تَرْجَمَہٗ فِی مَحْذُوْفٍ عِبْرَتٌ لِّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔ یہاں سرگذشت کا اصلی رخ یہود کی طرف ہے اور وہ تورات کے ذریعہ اس ماجرے سے اچھی طرح واقف تھے۔ قرآن پاک میں یہ اسلوب بہت استعمال ہوا ہے۔ ایک حماسی شاعر کہتا ہے:

اِذْ اَسْحَبُ الرِّیْطَ وَالْمُرُوْطَ اِلَیْ اِدْنِیْ تَجَارِیْ وَاَنْفِضُ اللِّیْمَا (۱۱۸)

(یاد کرو میرے لہو و لعب کے اس زمانے کو جب میں اپنی چادریں گھیٹتے قریب کے شراب

خانے میں جاتا تھا اور زلفوں کو لہراتا تھا)

یہاں اِذ سے پہلے اُذْکُرُوْا محذوف ہے۔

۱۴۔ کلام کا ایک نہایت اہم اسلوب معانی کا حذف کرنا ہے یعنی درمیان سے گفتگو کا وہ

حصہ حذف کر دیا جاتا ہے جسے قرینہ سے سمجھا جاسکتا ہو۔ مثال کے طور پر سورہ یوسف کا مطالعہ کیجیے۔ شاہی ساتی جیل سے چھوٹ کر بادشاہ کی خدمت میں لگ جاتا ہے اور ایک مدت کے بعد جب بادشاہ خواب دیکھتا ہے تو درباری تعبیر بتانے سے عاجز رہ جاتے ہیں ایسے موقع پر قرآن کہتا ہے:

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اَنْبِئْکُمْ بِتَاوِیْلِهِ فَاَرْسِلُوْنِ

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ (يوسف: ۲۵-۲۶)
 (ان دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا اور اسے ایک مدت دراز کے بعد اب بات یاد آئی،
 اس نے کہا میں آپ حضرات کو اس کی تاویل بتاتا ہوں مجھے ذرا (قید خانے میں یوسف
 کے پاس) بھیج دیجیے۔ یوسف! اے راست باز! مجھے اس خواب کی تعبیر بتا کہ سات موٹی
 گائیں ہیں الخ)

بائبل اور تلمود سے اس کی تفصیل یوں معلوم ہوتی ہے اور قیاس و قرینہ بھی یہی کہتا ہے کہ
 شاہی ساتی نے یوسف کے حالات بادشاہ اور اس کے درباریوں سے بیان کیا اور انھیں اپنے خواب کا
 قصہ اور اس کی تعبیر یاد دلائی جو حضرت یوسف نے انہیں بتائی تھی اور جو بالکل صحیح نکلی تھی۔ اس
 نے فوراً آگے بڑھ کر عرض کیا کہ اس خواب کی تعبیر میں آپ لوگوں کو بتاؤں گا۔ بشرطیکہ مجھے قید
 خانے میں ان سے ملنے کی اجازت دیں۔ درباریوں نے اجازت دے دی وہ جیل خانے میں حاضر
 ہو گیا اور جاتے ہی اُیُّہا الصِّدِّيق سے خطاب کیا۔ اتنی ساری باتیں قرینہ کی موجودگی کی وجہ سے
 حذف کر دی گئی ہیں۔

سورہ یسّٰ میں اس اسلوب کی کار فرمائی دیکھیے:

جب مرد مومن نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی تو فرمایا:

وَمَا لِي لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ؕ أَأَتَّخِذُ مِنْ دُونِهِ آلِهَةً إِنْ
 يُرِيدُ الرَّحْمَنُ بِضُرٍّ لَا تُغْنِي عَنْهُمْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَلَا يُنْقِذُونِ إِنْ
 لَأَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ إِنْ آمَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُونِ (یسین: ۲۲-۲۵)

(اور میں کیوں نہ بندگی کروں اس ذات کی جس نے مجھ کو پیدا کیا اور اسی کی طرف تم سب
 لوٹائے جاؤ گے! کیا میں اس کے سوا دوسروں کو معبود بناؤں اگر خدائے رحمان مجھے کوئی
 تکلیف پہنچانی چاہے تو نہ ان کی سفارش میرے کچھ کام آئے گی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں
 گے بے شک میں اس وقت ایک کھلی ہوئی گمراہی میں ہوں گا۔ میں تمہارے رب پر ایمان
 لایا تو میری بات سن لو۔)

اس کے فوراً بعد کہا گیا:

قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ (یسین: ۲۶) (ارشاد ہوا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ)

یہاں قرینے سے معلوم ہو رہا ہے کہ قوم نے مرد مومن کی دعوت رد کر دی اور اسے شہید کر دیا۔ شہادت نصیب ہوتے ہی اس شخص کو جنت کی بشارت دے دی گئی۔ جو نہی وہ موت کے دروازے سے گذر کر دوسرے عالم میں داخل ہوا فرشتے اس کے استقبال کو موجود تھے۔ انہوں نے اسے خوش خبری دی کہ فردوس بریں تمہارا منتظر ہے۔ قرآن نے ان تفصیلات کو حذف کر دیا کیوں کہ اطناب کلام کا عیب ہے اور قرینہ سے یہ باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔

۱۱۔ استفہام

کسی نامعلوم چیز کے بارے میں سوال کرنا استفہام کہلاتا ہے۔ مثبت اور منفی دونوں طریقوں سے سوال کیا جاتا ہے۔ مثبت سوال کے لیے قرآن کی یہ آیت پڑھیے:

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ لَنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ (قیامہ: ۳)

(کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر سکیں گے)

لیکن قرآن کی مندرجہ ذیل آیت منفی انداز میں سوال کی مثال پیش کرتی ہے:

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (ملک: ۱۴)

(کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے! وہ تو بڑا ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے)

استفہام اپنے عام مفہوم سے ہٹ کر دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور سوال

کرنے کے علاوہ اس کے دیگر فوائد بھی ہیں جن میں سے چند یہاں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ تاکید۔ بسا اوقات استفہام کے ذریعہ سوال کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ محض تاکید کے لیے

یہ اسلوب استعمال ہو جاتا ہے کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ ابو طیب متنبی کہتا ہے:

مَنْ لِّلْمِحَافِلِ وَالْجِحَافِلِ وَالسُّرَى فَقَدْتَ بِفَقْدِكَ نَيْرَ لَا يَطْلَعُ

وَمَنْ اتَّخَذَتْ عَلَى الضِّيُوفِ خَلِيفَةَ ضَاعُوا وَ مِثْلَكَ لَا يَكَادُ يَضِيعُ (۱۱۹)

(اب ان محفلوں، لشکروں کے لیے اور دشمنوں کے استیصال کے لیے کون بچا ہے؟ آپ

کے فوت ہونے سے آفتاب غروب ہو گیا۔ جو اب طلوع نہ ہوگا۔ آپ نے مہمانوں پر

کس کو نائب بنایا ہے۔ کہ وہ برباد ہو گئے ہیں۔ آپ جیسا آدمی کبھی برباد نہیں کرتا تھا)

یہاں دیکھیے استفہام سوال کرنے کے لیے نہیں آیا ہے۔ بلکہ مرثی کی عظمت و بلندی کو

اجاگر کرنے اور اپنی بات کو موکد بنانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ شاعر کا مندرجہ ذیل شعر دیکھیے۔

وہ اپنی محبوبہ کے حسن و جمال کا استفہامیہ انداز میں کس طرح تذکرہ کرتا ہے:

وَعَقَارِ عَيْشِ لَنْ يَعَاقِرَهَا عَيْشُ انِيقَ

هِيَ لِلزَّهْوِ نِظَامٌ وَ الْوَالِي الْلَهُوَ طَرِيقُ

قلت لَمَّا لَحَىٰ فِيهَا شِعَاعٌ وَبَرِيقٌ

أَشْفِيقٌ أُمَّ عَتِيقٌ أُمَّ رَحِيقٌ أُمَّ حَرِيقٌ

(اس کے پاس زندگی کے ساز و سامان ایسے ہیں کہ جو کسی بہترین زندگی گزارنے والے کو

بھی میسر نہیں! وہ نشو و ارتقاء کی پابند ہے اور لہو و لعب کی گذر گاہ!

جب مجھے اس کے اندر کہن اور کوند نظر آئی تو میں نے کہا

یہ سرِ پامحبت و شفقت ہے یا آزاد خاتون ہے؟ شراب کہنہ ہے یا شعلہ سوزاں؟

قرآن پاک میں استفہام کا یہ اسلوب تاکید و تعظیم کے معنی میں بہت استعمال ہوا ہے سورہ

قیامہ کی مندرجہ ذیل آیات میں استفہام کا زور دیکھیے:

أَلَمْ يَكُنْ نُطْفَةً مِنْ مَّنِيِّ يَمْنَىٰ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ فَجَعَلَ

مِنْهُ الذَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ

الْمَوْتَىٰ (قیامہ: ۳۷-۴۰)

(کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے پھر وہ ایک لو تھڑا بنا پھر اللہ

نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں

بنائیں کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے؟)

۲- کبھی کبھی استفہام اقرار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مقصد غور و تدبر کے بعد مخاطب کو اقرار و اعتراف پر آمادہ کرنا ہوتا ہے۔ ابن الرومی اپنے ممدوح عبید اللہ بن عبد اللہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

أَلَسْتَ الْمَرْءَ لَا عَزْمَ كَهَامٍ وَلَا بَخْلٌ إِلَيْهِ بَذْرُ انْتِسَابٍ

أَلَسْتَ الْمَرْءَ يَجِبِي كُلَّ حَمْدٍ إِذَا مَا لَمْ يَكُنْ لِلْحَمْدِ جَابٍ (۱۲۰)

(کیا آپ وہ شخص نہیں ہیں جس کا عزم کبھی پست نہیں ہوتا۔ اور جس کی طرف بخل کی

نسبت کبھی نہیں کی جاسکتی؟)

کیا آپ وہ مرد میدان نہیں ہیں جو تمام تعریفوں کو سمیٹ لیتا ہے۔ جب کہ تعریف کو

سمیٹنے والا کوئی نہیں ہوتا؟)

اس ممدوح کی تعریف دوسرے شعر میں یوں کرتا ہے:

أَلَسْتَ مَبْشُرِي فِي كُلِّ يَوْمٍ بوشك ترمثل إثر الشباب (۱۲۱)
 (جوانی ختم ہونے کے بعد جب کہ موت قریب آچکی ہے کیا آپ مجھے روزانہ حیات کی
 بشارت نہیں سناتے ہیں؟)

نکتری خلیفہ متوکل علی اللہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

أَلَسْتَ أَعْمَهُمْ جُودًا وَ أَزْكَا هُمْ عُودًا وَ امْضَاهُمْ حَسَامًا (۱۲۲)
 (کیا آپ تمام خلفاء میں سب سے زیادہ سخی، سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ
 رعب و دبدبہ والے نہیں ہیں؟)

یہاں تمام اشعار میں ابن رومی اور نکتری اپنے ممد و حین سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتے ہیں بلکہ
 ان سے ان کی خوبیوں کا اعتراف کرانا چاہتے ہیں۔

قرآن پاک نے اس اسلوب کو بڑے عمدہ طریقے سے استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر
 سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

أَفْتُومِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ
 ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ (۸۵)

(کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو۔
 پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں
 ذلیل و خوار ہو کر رہیں)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے ان کا یہ جرم باور کرانا چاہتا ہے کہ تمہاری ازل سے یہ
 روش رہی ہے کہ کتاب کے اُس حصے پر ایمان لاتے ہو جو تمہاری خواہشات کے مطابق ہوتی ہیں اور
 جو تمہاری ہوائے نفس کی تکمیل میں رکاوٹ بنتی ہیں ان کا انکار کر دیتے ہو کیا تمہارا یہ رویہ نہیں رہا ہے؟
 سورہ فیل میں ہے:

أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ وَ أَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ (فیل: ۲-۳)
 (کیا ان کی چال بالکل برباد نہ کر دی اور ان پر جھنڈ کی جھنڈ چڑیاں نہ بھیجیں؟)

یہاں سوال کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ مخاطب کو یہ باور کرانا مقصود ہے کہ ایسا ہو چکا ہے۔ سورہ صافات
 میں حضرت ابراہیم سے جب کسراصنام کے متعلق پوچھا جاتا ہے تو وہ اپنی قوم سے یوں سوال کرتے ہیں۔

أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ۔ (۹۵-۹۶)

(کیا تم لوگ اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو! اللہ ہی نے پیدا کیا ہے تم کو بھی اور ان چیزوں کو بھی جن کو تم بناتے ہو)

یہاں سوال کرنا مقصود نہ تھا کیوں کہ حضرت ابراہیمؑ کو ان بتوں کی حقیقت معلوم تھی۔ مقصد اس امر کا اعتراف کرانا تھا کہ یہ تمہاری عقل باختگی اور شامت زدگی ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی لکڑی اور پتھر کی مور توں کی پوجا کرتے ہو۔

۳- تعجب: کبھی کبھی استفہام کا استعمال تعجب کے لیے بھی ہوتا ہے مثال کے طور پر ابو طیب متنبیؒ کو بخار آ گیا تو اس نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

أبنت الدهر عندی کل بنت فکیف وصلت انت من الزحام (۱۲۳)

(میرے پاس زمانے کی تمام مصیبتیں جمع ہیں اے زمانے کی بیٹی (بخار مراد ہے) آخر تو اس اژدہام سے کیسے نکل آئی؟)

ابو تمامؒ اپنی حیرانی کا اظہار یوں کرتا ہے:

ما للخطوب طفت علیٰ کأنہا جہلت بان نداءک بالمرصاد (۱۲۴)

(حوادث زمانہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ میرے اوپر حملہ آور ہو گئے ہیں۔ گویا انہیں نہیں معلوم کہ تیری بخشش انتظار میں ہے؟)

سورہ قیامہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أیحسب الإنسان أن لن نجتمع عظامه (۳)

(کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟)

یہاں اللہ تعالیٰ استعجاب اور حیرت کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ انسان آفاق و انفس کی تمام نشانیوں کو اور اپنی خلقت و ممات کو دیکھتے ہوئے بعث بعد الموت کے بارے میں شک میں پڑا ہوا ہے؟ کیا اسے یہ پوری کائنات نظر نہیں آتی ہے؟ کیا وہ ان کی تخلیق پر غور نہیں کرتا؟

اسی سورہ میں پھر حیرت کے ساتھ کہتا ہے:

أیحسب الإنسان أن یتروک سدی (قیامہ: ۳۶)

(کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟)

یعنی جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر تعجب کر رہے ہیں کیا وہ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ انسان غیر مسئول چھوڑ دیا جائے گا؟ جب کائنات کی ہر چیز ایک مقصد کے تحت پیدا کی گئی ہے اور ہر ایک نظام فطرت کے ساتھ منسلک ہو کر مصروف عمل ہے تو کیا خاکی انسان اس بھری پُری دنیا میں بے کار محض بنایا گیا ہے اور کیا قیامت کے دن اس سے باز پرس نہ ہوگی؟

۴- انکار: بسا اوقات اظہار انکار کے لیے استفہام کو استعمال کیا جاتا ہے۔ متنبتی اپنے ممدوح کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے:

أتلتمس الأعداء بعد الذی رأت قیام دلیل أو وضوح بیان (۱۲۵)

(کیا دشمن میرے ممدوح کی تمام عظمتوں کو دیکھنے کے بعد بھی کسی دلیل یا وضاحت کی

تلاش میں ہیں؟)

یعنی دشمن جب کہ ہر سخت مرحلہ میں اور ہر نازک موقع پر ممدوح کی کامیابی اور بلند ہمتی دیکھ چکے ہیں اب انہیں اس کی عظمت و بلندی کے لیے کوئی اور دلیل تلاش کرنے کی زحمت نہیں کرنی چاہیے۔

مکتری کہتا ہے:

أ أكفرك النعماء عندی وقد نمت علی نمو الفجر والفجر ساطع

و أنت الّذی أغرزتنی بعد ذلّتی فلا القول مخفوض ولا الطرف خاشع (۱۲۶)

(کیا میں تیرے احسانات کا انکار کر سکتا ہوں جو میرے اوپر روشن فجر کی طرح بڑھتے

پھلتے رہے ہیں؟ آپ ہی کی ذات ہے جس نے مجھے عزت و شوکت بخشی جب کہ میں

ذلیل ہو چکا تھا لیکن اب باتوں میں پستی ہے نہ نگاہوں میں ذلت ہے)

یہاں شاعر اپنے ممدوح سے سوال نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس امر کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ

تیرے احسانات کے بوجھوں تلے دبا ہوا ہوں۔ تیری عنایات ہی نے مجھے ذلت کے گڑھے سے

نکال کر عزت و شہرت کے قصر رفیع تک پہنچایا ہے، تو کیا میں تیرے ان احسانات کو فراموش کر سکتا

ہوں؟ ہرگز نہیں یہ مجھ سے کبھی نہیں ہو سکتا۔

قرآن کہتا ہے:

أصطَفی البناتِ علی البنینَ مَا لَكُمْ كیف تَحْكُمُونَ (صافات: ۱۵۳-۱۵۴)

(کیا اس نے بیٹوں پر بیٹیوں کو ترجیح دی؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟)

یہاں قرآن نے انتخاب و ترجیح کا سرے سے انکار کیا ہے یعنی اللہ نے اس طرح کا کوئی انتخاب نہیں کیا ہے اور نہ اس کے یہ شایان شان ہے تم نے اپنے جی سے فرشتوں کو اس کی بیٹیاں قرار دیا ہے۔

سورہ مریم میں ہے:

أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا (مریم: ۷۸)

(کیا اس نے غیب میں جھانک کر دیکھ لیا ہے یا خدا سے کوئی عہد کر لیا ہے)

یہاں اللہ نے ان چیزوں کی تردید فرمائی ہے کہ نہ انھوں نے غیب کے پردوں میں جھانک کر ان تمام چیزوں کو دیکھا ہے جو ان کو آخرت میں ملنے والی ہیں نہ خدا سے انھوں نے گارنٹی لکھوائی ہے پھر آخر انہیں کس بوتے پر ناز ہے؟

قرآن پاک میں اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔

۵- امر: بسا اوقات استفہام امر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے قرآن پاک اس اسلوب کے استعمال سے بھرپڑا ہے چند ایک مثالیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ
وَيَصُدُّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ (مائدہ: ۹۱)

(شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارے اندر شراب اور جوئے کے ذریعہ بغض و عداوت ڈال دے اور

تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے روک دے پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟)

یہاں ہَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ دراصل اِنْتَهُوْا عَنْهَا کے معنی میں مستعمل ہے یعنی شراب اور

جوئے جو دنیوی نقصانات ہیں ان سے قطع نظر یہ چیزیں اللہ کی یاد اور نماز سے غافل کر دینے والی ہیں اس لیے تم ان سے باز آ جاؤ۔

سورہ ہود میں فرمایا:

فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا
هُوَ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (ہود: ۱۴)

(اب اگر وہ تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور یہ

کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں پھر کیا تم سر تسلیم خم کرتے ہو؟)

یہاں فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ استفہام کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ امر کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، یعنی اَسْلَمُوا لِهَذَا الْكِتَابِ وَآمَنُوا بِهِ (اس کتاب پر ایمان لے آؤ اور اسے صدق دل سے تسلیم کر لو)

سورہ فرقان میں ہے:

وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَتَصْبِرُونَ وَ كَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا (فرقان: ۲۰)
(ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے کیا تم صبر کرتے ہو تمہارا رب سب کچھ دیکھتا ہے)

یعنی اے مسلمانو اگر تمہارے مخالفین اپنے امتحان میں ناکام رہے تو ان کو ان کی قسمت کے حوالے کر دو اور تمہارے سامنے صبر کا جو مرحلہ ہے اس میں کامیابی کے لیے عزم و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھو اللہ تمہارا نگران ہے اگر تم ثابت قدم رہے تو وہ تمہیں ان مخالفتوں کے علی الرغم منزل مقصود تک پہنچائے گا۔ یہاں اَتَصْبِرُونَ دراصل اِصْبِرُوا کے مفہوم میں ہے۔

سورہ صافات میں ہے:

وَ إِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَ عِظَامًا ؕ إِنَّا لَمَدِينُونَ قَالَ هَلْ أَنْتُمْ مُطَّلِعُونَ فَاطَّلِعَ فَإِنَّ فِي سَوَاءِ الْجَحِيمِ (۵۳-۵۵)

(کیا واقعی جب ہم مر چکے ہوں گے اور مٹی و ہڈی ہو جائیں گے تو ہمیں جزا و سزا دی جائے گی؟ کہے گا ذرا جھانک کے دیکھو تو سہی! تو وہ جھانکے گا اور اس کو جہنم کے بالکل بیچ میں دیکھے گا) یہاں فَهَلْ أَنْتُمْ مُطَّلِعُونَ دراصل اِطَّلِعُوا فِيهَا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

سورہ شعراء میں ہے:

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ وَ قِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنْتُمْ مُجْتَمِعُونَ (شعراء: ۳۸-۳۹)

(ایک روز مقرر وقت پر جادو گر اکٹھا کر لیے گئے اور لوگوں سے کہا گیا کہ جمع ہو جاؤ)

یہاں فَهَلْ أَنْتُمْ مُجْتَمِعُونَ میں انداز تو استفہام کا ہے لیکن مفہوم امر کا ہے یعنی اِجْتَمِعُوا۔

اسالیب عرب سے واقفیت رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ جب امر کے اندر ترغیب و

تشویق اور تحریص کا مفہوم پیدا کرنا ہو تو وہ انشائیہ اسلوب کے قالب میں آنے کے بجائے خبریہ

اسلوب کے قالب میں آتا ہے اور اس پر حرف استفہام کا ورود اس میں مزید زور پیدا کر دیتا ہے۔

اس اسلوب میں امر کی جگہ استفہام کو استعمال کرنے میں یہی حکمت اور بلاغت کار فرما ہے۔

۶- تحقیر: بسا اوقات استفہام کا یہ اسلوب تحقیر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

متنبی کافر کی ہجو میں لکھتا ہے:

مِنْ أَيْةِ الطُّرُقِ يَأْتِي مِثْلَكَ الْكَرْمُ أَيْنَ الْمُحَاجِمِ يَا كَافُورُ وَالْجَلْمُ (۱۲۷)

(کن راستوں سے تمہارے پاس شرافت آسکتی ہے؟ اے کافر سینگلی اور استرا کہاں چھوڑ کے آئے ہو؟)

یہاں سوال کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ شاعر کافر کا مذاق اڑا رہا ہے اور اس کی تنقیص کر رہا

ہے۔ ابوالعلاء معری کہتا ہے:

أَتُظَنُّ أَنَّكَ لِلْمَعَالِي كَاسِبٌ وَنَحْبِيُّ أَمْرِكَ شِرَّةٌ وَشِنَارُ (۱۲۸)

(کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم بلند کارناموں کے حصول کے لیے پیدا ہوئے ہو اور تمہیں بلند مراتب

مل جائیں گے۔ جب کہ حرص و حسد جیسی بدترین برائیاں تمہارے اندر پوشیدہ ہیں؟)

ایک دوسرا شاعر دشمن کی دھمکیوں کا مذاق یوں اڑاتا ہے:

فَدَعِ الْوَعِيدَ فَمَا وَعِيدُكَ ضَائِرِي أَطْنِينَ أَجْنَحَةَ الذَّبَابِ يَضِيرُ (۱۲۹)

(یہ گیدڑ بھکی چھوڑ دو کہ اس سے میرا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے۔ کیا مکھیوں کی بھنھناہٹ

سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے؟)

سورہ صافات میں فرمایا:

أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ (صافات: ۱۲۵)

(کیا تم لوگ بعل کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑتے ہو)

یہاں حضرت الیاس نے اپنی قوم پر پھبتی کی ہے کہ تم لوگ کس قدر نامعقول ہو کہ بہترین

خالق اللہ کو چھوڑ کر جو تمہارا اور تمہارے تمام اگلوں کا رب ہے، بعل دیوتا کی پرستش کرتے ہو جو

ایک بے جان پتھر ہے!

اسی سورہ میں حضرت ابراہیم کا قول یوں نقل کیا گیا ہے:

مَاذَا تَعْبُدُونَ أَفْئَكَا أَلِهَةً مِنْ دُونِ اللَّهِ تُرِيدُونَ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ

الْعَالَمِينَ (صافات: ۸۵-۸۷)

(یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر دوسرے من گھڑت

معبودوں کے طالب ہو؟ تو خداوند عالم کے باب میں تمہارا کیا گمان ہے!)

ظاہر ہے یہاں سوال کرنے کا مقصد بتوں کا مذاق اڑانا اور ان کی تحقیر کرنا ہے۔ آگے حضرت ابراہیمؑ بتوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

أَلَا تَأْكُلُونَ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُونَ (۹۱-۹۲)

(آپ لوگ نوش نہیں فرماتے! کیا بات ہے کچھ بولتے نہیں!)

یہاں حضرت ابراہیمؑ بتوں پر طنزیہ فقرے چست کر رہے ہیں کہ یہ لذیذ کھانے اور حلوے مانڈے جو آپ کے پجاریوں نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں ان کو آخر تناول کیوں نہیں فرماتے! اور یہ آپ لوگ چپ چپ سے کیوں ہیں! کچھ گفتگو کیوں نہیں کرتے؟

سورہ انعام میں ہے:

قُلْ أَغْيَرَ اللَّهُ وَليًا فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (۱۴)

(کہو کیا میں اللہ کے سوا، جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے، کسی اور کو اپنا کارساز بناؤں اور

وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں)

یہاں سوال کرنا مقصد نہیں ہے بلکہ غیر اللہ معبودوں کی بے وقعتی ظاہر کرنا اور ان پر تعریض کرنا مقصود ہے۔ فرمایا کہ مولیٰ و مرجع بنائے جانے کا سزاوار تو وہ ہے جس کے فضل و کرم سے سب کو روزی مل رہی ہے نہ کہ تمہارے وہ اصنام خیالی جن کے سلسلے میں تمہیں خود یہ تسلیم ہے کہ ان کے آگے حلوے مانڈے تم پیش کرتے ہو تب وہ راضی و آسودہ ہوتے ہیں۔

سورہ شعراء میں ہے:

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ قَالَ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا

بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ مُوقِنِينَ (شعراء: ۲۳-۲۴)

(فرعون نے پوچھا اور یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا کہ آسمانوں اور زمین

اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا خداوند، اگر تم لوگ یقین کرنے والے بنو!)

اوپر حضرت موسیٰ اور فرعون کی طویل گفتگو نقل ہوئی ہے جس میں حضرت موسیٰ نے اس کو توحید کی دعوت دی تھی اور اس کے طعنے اور اظہار احسان کا مسکت جواب دے دیا تھا اب اس کے لیے کچھ مزید کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی اس وجہ سے اس نے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے حضرت موسیٰ کے دعوائے رسالت کا مذاق اڑانے کی کوشش کی اور بانداز تحقیر سوال کیا کہ یہ رب العالمین کیا چیز ہے جس کے تم رسول بن کر آئے ہو؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ سب سے بڑے دیوتا کا اوتار اور

رب العالمین تو میں ہوں، تو میرے ہوتے اور کون رب العالمین ہے، جس نے تم کو رسول بنا کر بھیجا؟ سورہ ہود میں حسرت شعیبؑ جب اپنی قوم کو توحید اور بندگی کی دعوت دیتے ہیں تو قوم ان کا مذاق یوں اڑاتی ہے:

يَشْعِبُ أَصْلُوْتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاءُ نَا وَ أَنْ نَفْعَلَ فِي
أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ (ہود: ۸۷)

(اے شعیب کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھلاتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ بیٹھیں جن کی ہمارے باپ دادا پرستش کرتے آئے یا یہ کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں؟ بس تمہیں تو ایک دانشمند اور راست رو رہ گئے ہو!)

یہاں دیکھیے اسلوب استفہام کا ہے لیکن پورا فقرہ طنز و تضحیک سے پر ہے۔ قوم کے لوگوں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ کیا تمہاری نماز تمہیں یہی سکھاتی ہے کہ جن معبودوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے۔ ہم ان کی عبادت ترک کر دیں اور اپنے مال میں اپنی صوابدید کے مطابق تصرف نہ کریں۔ تمہاری ان باتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نگاہ میں سب گلے پچھلے بے وقوف اور گمراہ تھے بس تمہی ایک داناو بیانا اور راہیاب رہ گئے ہو۔

۷۔ تونخ: بسا اوقات استفہام کے اسلوب میں لعنت و ملامت اور زجر و تونخ کا فائدہ بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک شاعر مخاطب افراد کو ملامت یوں کرتا ہے:

إِلَامَ الْخُلْفُ بَيْنَكُمْ إِلَامَا وَ هَذِي الضَّجَّةُ الْكَبْرَى عَلَامَا؟ (۱۳۰)

(تم لوگوں میں یہ وعدہ خلائی کب تک جاری رہے گی اور یہ نالہ و شیون کس بات پر ہے)

یہاں شاعر نے مخاطب کو وعدہ خلائی اور چیخ و پکار مچانے پر ملامت کی ہے۔ ابوالطیب متنبیؒ کہتا ہے:

حَتَّى مَتَى أَنْتَ فِي لَهْوٍ وَ فِي لَعِبٍ وَ الْمَوْتُ نَحْوَكُ يَهُوِي فَاتِحًا فَاهَا (۱۳۱)

(کب تک تم لہو و لعب میں مست رہو گے جب کہ موت منہ کھولے تمہاری طرف بڑھ رہی ہے)

سورہ شعراء میں فرعون نے حضرت موسیٰؑ کا استخفاف کیا جب انہوں نے انذار کے ساتھ

ساتھ اس کے سامنے بنی اسرائیل کو ساتھ لے جانے کا مطالبہ بھی رکھا۔ اس نے زجر و ملامت کے

انداز میں کہا:

أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَ لَيْدًا وَ لَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ (شعراء: ۱۸)

(کیا ہم نے تم کو بچپن میں اپنے اندر پالا نہیں؟ اور تم نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے اندر بسر کیے؟)

دراصل فرعون یہ تصور نہ کر سکتا تھا کہ کوئی اس کے سامنے اتنا بڑا دعویٰ اور اتنا اہم مطالبہ لے کر آئے گا اور وہ بھی ایک اسرائیلی! چنانچہ اس نے نفرت و توتیخ اور زجر و ملامت کے انداز میں کہا کہ کیا تم وہی نہیں ہو جس کی پرورش بچپن میں ہم نے اپنے گھر میں کی ہے۔ یعنی ایاز قدر خود راہناس! تم ہمارے پروردہ ہونے کے باوجود ہمارے سامنے اپنی نبوت کا دعویٰ کر رہے ہو اور بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ لے کر اٹھے ہو! اب میری بلی مجھی کو میاؤں میاؤں کہے گی؟

سورہ یونس میں ہے:

أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۶۸)

(کیا تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں ہیں)

یہاں اللہ تعالیٰ منکرین حق کو ڈانٹ رہا ہے کہ کیا تمہیں اللہ کے خلاف بے بنیاد باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ تم خدا کے عذاب سے بالکل ہی بے پروا ہو گئے ہو؟

سورہ القارعة کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

الْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ (۱-۳)

(کھٹکھٹانے والی، کیا ہے کھٹکھٹانے والی! اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے کھٹکھٹانے والی!)

اس اسلوب میں عوام کی غفلت و نااندیشی پر سرزنش اور توتیخ ہے۔ یہاں سوال کی نوعیت ایک الارم کی ہے تاکہ جو لوگ اس کو معمولی بات سمجھ کر اس سے بے پروا ہیں وہ چوکنے ہو جائیں اور کان کھول کر اس کا حال سن لیں۔

۸- نفی: کبھی کبھی استفہام اپنے عام معنی سے نکل کر مجرد نفی کا معنی بھی دیتا ہے۔

ابن رومی اپنے ایک قصیدے میں ابن بلبل کی مدح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

أَعْرِفُهُ وَ لَسْتُ لَهُ نَسِيبًا وَ تَجْهَلُهُ وَ أَنْتَ لَهُ نَسِيبٌ

(کیا میں اس سے واقف رہوں جب کہ میرا اس سے کوئی نسبی رشتہ نہیں ہے اور آپ اس

سے ناواقف ہیں جب کہ آپ کا وہ رشتہ دار ہے۔)

یہاں أَعْرِفُهُ دراصل لَا أَعْرِفُهُ کے معنی میں مستعمل ہے۔ بختری کہتا ہے:

هل الدهر إلا غمرة و انجلاءها و شيكا و إلا ضيقة و انفراجها (۱۳۲)

(زمانہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایک سختی آئے اور فوراً ختم ہو جائے، تنگی ہو اور فوراً اس

کے دہانے کھل جائیں)

یہاں هل الدھر دراصل مَا الدھر کے معنی میں ہے۔ ابو تمام کہتا ہے:

هل اجتمعت أحياء و معد و مدحج بملتحم إلا و أنت أميرها (۱۳۳)

(معد اور مدحج کے قبائل میدان جنگ میں جمع نہیں ہوئے مگر آپ ان کی قیادت کر رہے تھے)

یہاں هل اجتمعت دراصل مَا اجتمعت کے مفہوم میں ہے۔

قرآن مجید نے اس اسلوب کو بہت استعمال کیا ہے۔ سورہ دھر میں ہے:

هَلْ أُنِى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينَ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكَورًا (۱)

(کیا گذرا ہے انسان پر کوئی وقت زمانے میں، جب کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا)

یہاں هل نفی کے معنی میں ہے۔

سورہ یونس میں فرمایا:

ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا

كُنتُمْ تَكْسِبُونَ (یونس: ۵۲)

(پھر ظالموں سے کہا جائے گا اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو۔ جو کچھ کماتے رہے ہو اس

کے پاداش میں اس کے سوا اور کوئی بدلہ نہیں دیا جاسکتا)

یہی اسلوب یہاں بھی کار فرما ہے هل نفی کے معنی میں ہے۔

سورہ فاطر میں ہے:

فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا سُنَّةَ الْأَوَّلِينَ (فاطر: ۴۳)

(پس یہ نہیں انتظار کر رہے ہیں مگر اسی سنت الہی کا جو اگلوں کے باب میں ظاہر ہوئی)

سورہ نحل میں ہے:

هَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرُ رَبِّكَ (نحل: ۳۳)

(یہ لوگ نہیں منتظر ہیں مگر اس بات کے کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرے رب کا حکم ہی آجائے)

یہاں هل نفی کے معنی میں ہے۔ یعنی یہ متکبرین رسالت کی تصدیق کے لیے اس وقت تک تیار

نہیں جب تک ان کے پاس فرشتے نہ آئیں یا ان پر وہ عذاب ہی نہ آجائے جس کی ان کو خبر دی جا رہی ہے۔

۱۲- نفی

کلام عرب میں نفی کا استعمال عام طور پر کسی شے کے عدم کے اثبات کے لیے ہوتا ہے لیکن اس کے استعمال کی کئی شکلیں ممکن ہیں۔ جن میں سے چند ایک پر یہاں روشنی ڈالی جاتی ہے:

۱- نفی الملزوم بلازمہ :- یعنی بظاہر ایک شے کی نفی ہوتی ہے لیکن مقصود دراصل ملزوم کی نفی ہوتی ہے۔ کلام پاک اور کلام عرب میں اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ امرؤ القیس اپنے ایک قصیدے میں ایک صحرائی راستے کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

عَلَى لَاحِبٍ لَا يَهْتَدِي بِمَنَارِهِ إِذَا سَافَهُ الْعُودُ النَّبَاطِيُّ جَرَجْرًا (۱۳۴)

(واضح راستے پر، جس کی برجیوں سے راستہ معلوم نہیں کیا جاتا، جب موٹا تازہ اونٹ اسے

سوگھتا ہے تو بلبلا اٹھتا ہے)

یہاں شاعر کا مقصود یہ نہیں ہے کہ راستے میں برجیاں تو ہیں لیکن ان سے راستہ نہیں معلوم ہوتا ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس صحرائی رہنمائی کے لیے برجیاں اور منارے ہیں ہی نہیں۔ ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:

لَيْسَ بِهَا ضَبٌّ فَيَنْحَجِرُ (اس میں کوئی گوہ نہیں ہے جو رینگے)

یعنی وہاں سرے سے کوئی گوہ ہی نہیں ہے۔ ایک عرب عورت کہتی ہے:

أَلَا فَاقْصِرِي مِّنْ دَمْعِ عَيْنِيكَ لَنْ تَرِي أَبَا مَثَلِهِ تَنْمِي إِلَيْهِ الْمَفْخَرُ (۱۳۵)

(خاموش ہو جاؤ، اپنی آنکھوں کے آنسوؤں کو روک لو، تم اس جیسا کوئی باپ نہ پاسکوگی

جس پر قابل فخر کارنامے ختم ہو چکے ہیں)

یعنی مرثی جیسا کوئی باپ موجود ہی نہیں ہے کہ تم اسے دیکھ سکو۔

ایک تیسرا شعر ہے:

تَرْدِينَ جَلْبَابَ الْحَيَاءِ فَلَمْ يَرِي لَذِيُولَهْنَ عَلَى الطَّرِيقِ غَبَارُ

(وہ حیا کی چادر اوڑھتی ہیں۔ راستے میں ان کے دامن پر غبار نظر نہیں آتا)

یہاں شاعر کی مراد یہ ہے کہ یہ شریف زادیاں گھر سے باہر قدم ہی نہیں نکالتی ہیں کہ ان کے دامن پر گرد و غبار نظر آنے کی نوبت پہنچے۔

قرآن کہتا ہے:

لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (بقرہ: ۴۸)
(نہ کسی کی طرف سے شفاعت قبول ہوگی اور نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی)

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس دن نہ کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا، نہ کوئی شفاعت قبول ہوگی، نہ کسی کے پاس دینے کے لیے معاوضہ ہوگا، نہ کسی سے معاوضہ لیا جائے گا، نہ کسی کی حمایت اور مدد کی جاسکے گی۔

سورہ یونس میں فرمایا:

قُلْ أَتَنْبِئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (۱۸)
(اے نبی، ان سے کہو کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے نہ وہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں)

سورہ رعد میں یہی مضمون یوں بیان ہوا ہے:

أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ (۳۳)
(کیا تم اللہ کو ایک نئی بات کی خبر دے رہے ہو جسے وہ زمین میں نہیں جانتا یا تم لوگ یونہی جو منہ میں آتا ہے بس کہہ ڈالتے ہو)

یہاں مقصود یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں سرے سے کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جسے اللہ نہ جانتا ہو جو کچھ بھی موجود ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔

سورہ نور میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

رِجَالٌ لَا تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَ إِقَامِ الصَّلَاةِ وَ
إِيتَاءِ الزَّكَاةِ (۳۷)

(یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی)

بعض مفسرین اس عدم غفلت کی ایک وجہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ ہر دم ذکر الہی میں مشغول رہتے ہیں اور بیچ و شراب میں لگتے ہی نہیں کہ ذکر الہی سے غفلت کا مرحلہ آئے۔ (۱۳۶)

۲۔ کبھی کبھی ایک فعل کی نفی کر کے اس کے عکس کو ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے اس اسلوب کے مطابق قرآن میں بکثرت لَا يُحِبُّ کو يُبْغِضُ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل آیات کو دیکھیے:

وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (حدید: ۲۳)

(اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے اور فخر جتاتے ہیں)

سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ (۲۷۶)

(اور اللہ ناشکروں اور حق تلفوں کو پسند نہیں کرتا)

سورہ اعراف میں فرمایا:

إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (۵۵) (وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

ان تمام مقامات پر لَا يُحِبُّ (وہ محبت نہیں کرتا) دراصل يُبْغِضُ (وہ نفرت کرتا ہے)

کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۳۔ بسا اوقات فعل کی نفی اس کے نتیجہ کے اعتبار سے ہوتی ہے یا دوسرے الفاظ میں ایک فعل کی نفی اس کے کسی خاص مفہوم کے پہلو سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سورہ انفال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى (انفال: ۱۷)

(اور اے نبی، جب تو نے پھینکا تو تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا)

غزوہ بدر میں آنحضرتؐ نے مٹھی بھر کنکریاں لیں اور قریش کی طرف رخ کر کے فرمایا شَاهَتِ الْوُجُوهُ (خدا یا یہ چہرے بد نما ہو جائیں!) اس کے بعد کنکریاں ان کی طرف پھینک دیں اور صحابہ کرام سے فرمایا، آگے بڑھو۔

اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مَا رَمَيْتَ میں نتیجہ فعل مراد لیا ہے کیوں کہ یہ ثابت ہے کہ آپؐ نے کنکریاں پھینکی تھیں البتہ اگر اللہ انھیں کار آمد اور دشمنوں کے لیے مہلک نہ بناتا تو آپ

کا یہ عمل عدم رمی کے برابر تھا۔ اسی لیے آگے وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی کہہ کر نتیجہ کو خدا کی طرف موڑ دیا ہے۔ اس آیت میں نفی و اثبات دونوں کے ساتھ ساتھ آنے میں یہی حکمت مضمّن ہے۔

مندرجہ بالا آیت سے ذرا قبل ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (انفال: ۱۷)

(تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا)

آیت کے اس ٹکڑے میں بھی یہی اسلوب کار فرما ہے۔

۴۔ بسا اوقات مبالغہ کی نفی کی جاتی ہے اور مقصود نفی میں مبالغہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر امرؤ القیس کہتا ہے:

وَلَيْسَ بِذِي سَيْفٍ فَيَقْتُلَنِي بِهِ وَلَيْسَ بِذِي رُمْحٍ وَلَيْسَ بِبَنّٰلٍ (۱۳۷)

(وہ تلوار بھی نہیں رکھتا کہ اس سے مجھے قتل کر دے نہ اس کے پاس نیزہ ہے نہ اسے تیر

چلانے کا ڈھنگ آتا ہے)

یہاں لیس بنّال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تیر چلانے میں ماہر نہیں ہے بلکہ شاعر کا مقصود یہ ہے کہ اسے تیر چلانے کا فن آتا ہی نہیں ہے۔

ایک دوسری جگہ کہتا ہے:

اِذَا الْمَرْءُ لَمْ يَخْزَنْ عَلَيْهِ لِسَانُهُ فَلَيْسَ عَلٰی شَيْءٍ سِوَاهُ بِخَزَانٍ (۱۳۸)

(جب آدمی خود اپنے راز کی حفاظت نہ کر سکے تو وہ دوسروں کے رازوں کی کیسے پروا کر سکتا ہے؟)

یہاں بھی لیس بخزان نفی میں مبالغہ پیدا کرنے کے لیے آیا ہے یعنی جب وہ اپنے راز کی حفاظت نہیں کریگا تو دوسروں کے اسرار کے سلسلے میں اور زیادہ غفلت اور مجرمانہ کوتاہی کا ثبوت دیگا۔

قرآن کہتا ہے:

وَ اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلّٰمٍ لِّلْعَبِيْدِ (آل عمران: ۱۸۲)

(اور اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے)

سورہ ق میں یہی مضمون یوں بیان ہوا ہے:

وَ مَا يُبَدِّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَ مَا اَنَا بِظَلّٰمٍ لِّلْعَبِيْدِ (۲۹)

(میرے یہاں بات پلٹی نہیں جاتی اور میں اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا)

اسی سورہ میں نبی کو مخاطب کر کے یوں کہا گیا ہے:
 نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَ مَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكَرَ بِالْقُرْآنِ مَنْ
 يَخَافُ وَعَيْدٍ (ق: ۴۵)

(اے نبی جو یہ لوگ باتیں بنا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں اور تمہارا کام ان سے جبراً
 بات منوانا نہیں ہے۔ بس تم اس قرآن کے ذریعہ ہر اس شخص کو نصیحت کرو جو میری
 تنبیہ سے ڈرے)

یعنی تم کسی پر زور زبردستی نہ کرو بس انہیں قرآن کی آیات سنا کر یاد دہانی کراؤ۔ تمہارا کام
 صرف تبلیغ و تذکیر ہے۔ تم ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔

۵۔ کان اور اسم فاعل کے ساتھ حرف نفی لا کر استمرار و دوام کے معنی پیدا کرنا مثلاً:
 أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا
 كَانُوا مُهْتَدِينَ (بقرہ: ۱۶)

(یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے مگر یہ سودا ان کے لیے
 نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستہ پر نہیں ہیں)

یعنی یہ یہود ہدایت پر ضلالت کو ترجیح دینے کی وجہ سے اور کتمان حق اور حسد و رقابت کی
 آگ میں جلنے کی وجہ سے کبھی بھی ہدایت نہیں پاسکتے اللہ نے ان کو ہمیشہ کے لیے دھتکار دیا ہے اور
 ان پر ذلت و مسکنت تھوپ دی ہے۔

سورہ اعراف میں فرمایا:

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِم بِعِلْمٍ وَ مَا كُنَّا غَائِبِينَ (اعراف: ۷)

(پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشت ان کے سامنے پیش کر دیں گے آخر
 ہم کہیں غائب تو نہیں تھے)

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل سے ابد تک کبھی غائب نہیں رہا۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے

گا۔ اسی طرح سورہ بقرہ میں فرمایا:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَ بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ

(بقرہ: ۸)

(اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں)

ظاہر ہے کہ جو لوگ خدا اور آخرت پر تو ایمان رکھنے کا دعویٰ کریں لیکن رسول کی رسالت کا انکار کریں وہ اپنے ایمان و اخلاص میں سچے کیسے ہو سکتے ہیں اور جب تک یہ ذہنیت باقی رہے گی مستقبل میں ان کی ہدایت کی کسی قسم کی توقع نہیں کی جاسکتی اسی لیے فرمایا وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ۔
 نفی کے مفہوم میں استمرار و دوام پیدا کرنے کا ایک اسلوب اور ہے وہ یہ کہ نفی حرفِ گان پر داخل ہو اور گان کی خبر فعل مضارع ہو اور اس پر "ل" داخل ہو۔ جیسے: "مَا كَانَ لِيَفْعَلَ" قرآن کہتا ہے:

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الْكَافِرِينَ - (اعراف: ۱۰۱)

(ان کے پاس ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر آئے مگر جس چیز کو وہ ایک دفعہ جھٹلا چکے تھے پھر اسے وہ ماننے والے نہ تھے۔ دیکھو اسی طرح ہم منکرین حق کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں) ان دونوں اسلوبوں کی بہترین مثال سورہ انفال کی یہ آیت ہے:

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ (۳۳)

(اس وقت تو اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جب کہ تو ان کے درمیان موجود تھا اور نہ اللہ کا قاعدہ ہے کہ لوگ استغفار کر رہے ہوں اور وہ ان کو عذاب دے دے)

یہاں وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ میں پہلا اسلوب اور وَمَا كَانَ مُعَذِّبَهُمْ میں دوسرا اسلوب کار فرما ہے یعنی کسی نبی کی موجودگی میں قوم پر کبھی عذاب نہیں آسکتا۔ اسی طرح قوم اگر مجموعی طور پر استغفار پر آمادہ ہو تو اللہ خواہ مخواہ انہیں عذاب میں مبتلا نہیں کرتا یہ اس کا مستقل اصول ہے۔
 سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُذَرَّ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ سَتَىٰ يَبِيئُ الْخَبِيثَاتِ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ (۱۷۹)

(اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہر گز نہ رہنے دے گا جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو غیب پر مطلع کر دے۔ اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے) فرمایا کہ جو جماعت تمام دنیا کی صلاح و فلاح کا ذریعہ بننے والی ہے وہ صالح و فاسد دونوں کا ملغوبہ بنی رہے یہ ناممکن ہے۔ چنانچہ مخلص اہل ایمان کو ابھارنے اور فاسد عناصر کو الگ کرنے کے لیے کوئی تدبیر اختیار کرنا ضروری ہے ایک شکل تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ غیب کا علم دے دے اور ہر آدمی جان جائے کہ مومن کون ہے اور منافق کون، لیکن یہ اللہ کی حکمت کے خلاف ہے۔ غیب کی باتوں کے لیے وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور ان کو امور غیب میں سے جس چیز سے چاہتا ہے آگاہ فرمادیتا ہے۔ اس کی بہترین شکل امتحان ہے۔ چنانچہ مومن و منافق کو چھانٹنے کا اللہ نے ازل سے یہ دستور بنایا ہے کہ وہ انہیں آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اللہ کے اس اصول میں کبھی تبدیلی نہیں آسکتی۔

سورہ بقرہ میں فرمایا:

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرُءُوفٌ رَّحِيمٌ (۱۴۳)

(اللہ تعالیٰ تمہارے اس ایمان کو ہر گز ضائع نہیں کرے گا۔ یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق و رحیم ہے)

یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو کبھی ضائع اور برباد نہیں کر سکتا وہ تو رحمت و رؤف کا پیکر ہے وہ بھلا اپنے مومن بندوں کو کیوں کر برباد کر سکتا ہے۔

۶- نفی وقوع: یعنی کسی چیز کے وقوع کی مکمل نفی ہو۔ مثال کے طور پر سورہ نور میں فرمایا:

فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ (۳۰)

(قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی)

یعنی اللہ کی خلقت میں کسی قسم کا تغیر ممکن نہیں ہے۔

کبھی کبھی اس سے مراد نفی جواز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ بقرہ میں فرمایا:

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ

فی الحج۔ (۱۹۷)

(جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران

میں اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بد عملی، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو)

یعنی جو لوگ ان متعین ایام میں حج یا عمرہ کی نیت کریں، وہ ان پابندیوں کو نباہیں ان کے لیے

شہوت و نافرمانی اور لڑائی جھگڑا جائز نہیں ہے وہ زیادہ سے زیادہ نیکی اور تقویٰ کی کمائی کرنے کی کوشش کریں۔

۱۳- حال

کلام عرب میں حال کے استعمال کی کئی شکلیں ہیں۔ یہاں صرف دو شکلوں کے استعمال پر گفتگو کرنی ہے:

۱۔ کبھی مضاف الیہ سے حال ہوتا ہے۔ جیسے سورہ شعراء میں ہے:

فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ (۴)

(پس ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں)

یہاں خاضعین حال ہے ہُم مضاف الیہ سے

۲۔ مجرور سے حال ہونا تو کلام عرب میں عام ہے۔ امرؤ القیس اپنے گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے:

فَلَمَّا اجَنَّ الشَّمْسُ عَنِّي غِيَارَهَا نَزَلَتْ إِلَيْهِ قَائِمًا بِالْحَضِيضِ (۱۳۹)

(جب سورج غروب ہو گیا تو میں اتر کر اپنے گھوڑے کے پاس آیا اور حال یہ تھا کہ وہ ہموار

زمین پر کھڑا تھا)

یہاں قائماً بالحضیض حال ہے الیہ کی ضمیر مجرور سے۔

اپنے مشہور معلقہ میں وہ کہتا ہے:

كَأَنَّ سَرَاتَهُ لَدَى الْبَيْتِ قَائِمًا مَدَاكَ عُرُوسٍ أَوْ صَلَايَةَ حَنْظَلٍ (۱۴۰)

(جب گھوڑا گھر کے پاس کھڑا ہوتا ہے تو اس کی پیٹھ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے دلہن کی

مہندی پسینے کی سل یا حنظل پھل توڑنے کا چوڑا پتھر)

یہاں بھی قائماً حال ہے سراتہ کی ضمیر مضاف الیہ سے۔

اعشى کہتا ہے:

وَقِيَامِي عَلَيْهِ غَيْرِ مُضْبِعٍ قَائِمًا بِالْغَدْوِ وَالْأَصَالِ (۱۴۱)

(اور صبح و شام مستعدی کے ساتھ میری طرف سے اس کی دیکھ بھال ضائع نہ ہوگی)

اس مثال میں بھی قائماً قیامی کی ضمیر مضاف الیہ سے حال ہے۔

نابغہ بن جعدہ کہتا ہے:

تَلَّأَ لَأَ كَالشَّعْرَى الْعَبُورِ تَوَقَّدَتْ وَ كَانِ عَمَاءٌ دُونَهَا فَتَحَسَّرَا (۱۴۲)

وہ چمکا جیسے شعری عبور ابر سے نکل کر چمک گیا ہو)

یہاں بھی توقدث حال ہے الشعری العبور مجرور سے۔

آگے یہی شاعر کہتا ہے:

وَ نَهْنَهْتَهُ حَتَّى لَبَسَتْ مِغَاضَةً مِضَاعِفَةً كَالنَّهْيِ رِيحٍ وَ أَمْطَرَا (۱۴۳)

(میں نے اسے روکا یہاں تک کہ ایک ڈھیلی ڈھالی زرہ پہنی جس میں اس تالاب کی سی

لہریں تھیں جس پر ہوا چلی گئی ہو اور پانی برس گیا ہو)

اس شعر میں ریح و أمطرا حال ہے النہی مجرور سے۔

ابو ذویب الہذلی کہتا ہے:

وَ لِيَأْتِيَنَّ عَلَيْكَ يَوْمٌ مَرَّةً يَبْكِي عَلَيْكَ مَقْنَعًا لَا تَسْمَعُ (۱۴۴)

(تم پر ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب تم کو دفن کر کے تم پر ماتم کیا جائے گا اور تم کچھ سن نہ

سکو گے)

اس شعر میں مقنعاً حال ہے عليك کی ضمیر مجرور سے۔

یہی شاعر اسی قصیدے میں آگے یوں مرثیہ خوانی کرتا ہے:

وَ بَدَّالَهُ أَقْرَابَ هَذَا رَائِعًا عَجَلًا فَعِيثَ فِي الْكِنَانَةِ يَرْجِعُ (۱۴۵)

(اور اس کی کمر اس کے سامنے نمایاں ہوئی اس حال میں کہ وہ ادھر ادھر پھسل رہی تھی

چناں چہ اس نے فوراً ترکش کی طرف ہاتھ بڑھایا)

لبید اپنے معلقہ میں کہتا ہے:

بَاتَتْ وَ أَشْبَلَتْ وَ أَكْفَتْ مِنْ دِيمَةٍ يُرْوِي الْخِمَائِلَ دَائِمًا تَسْجَامُهَا (۱۴۶)

(اور رزات ایسی بسر کی کہ وہ جھڑی جو درختوں کی زمینوں اور گھاس والے تھلوں کو تروتازہ

کرے، برابر لگی رہی)

اس شعر میں دَائِمًا تَسْجَامُهَا حال ہے ديمَة مجرور سے۔

امرؤ القیس اپنے ایک دوسرے قصیدے میں کہتا ہے:

تلاعب اولاد الوعول رباعها دوین السّماء فی رءوس المجادل
مکّلة حمراء ذات أسرة لها حبك كأنها من وصائل (۱۳۷)

(اس کے اونٹ پہاڑی بکروں کے بچوں سے ان پہاڑوں پر دل لگی کرتے ہیں جو آسمان سے بات کرتے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ ان پر بدیسیوں کا سایہ رہتا ہے۔ وہ سرخ ہیں اس

کے پودوں میں راستے ہیں جیسے دھاری دار چادریں ہوں۔)

اس میں مکّلة حال ہے المجادل مضاف الیہ سے۔

امیہ بن ابی الصلت کہتا ہے:

فهل تخفی السّماء علی بصیر و هل بالشمس طالعة خفاء (۱۳۸)

(کیا بصیر و علیم خدا پر آسمان مخفی رہ سکتا ہے؟ اور کیا سورج جو طلوع ہو پردہ خفا میں رہ سکتا ہے؟

اس شعر میں طالعة حال ہے بالشمس مجرور سے۔

طرفہ کی بہن خرنق کہتی ہے:

غداة أتاهم بالخیل شعناً یدق نسورها حد القضاض (۱۳۹)

(اس صبح کو جب کہ وہ ان کے اوپر حملہ آور ہوا گھوڑوں سے اس حال میں کہ وہ گرد میں

اٹے ہوئے تھے اور ان کے کھر کنکریوں کو اڑا رہے تھے)

یہاں بھی شعناً حال ہے بالخیل مجرور سے۔

اس اسلوب کو قرآن نے جگہ جگہ استعمال کیا ہے:

سورہ ق میں ہے:

یَوْمَ تَشَقُّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا (۴۴)

(جس دن زمین اوپر سے کھل جائے گی اور حال یہ ہوگا کہ وہ نکلنے میں جلدی کرتے

ہوں گے)

یہاں لفظ سِرَاعًا حال ہے عنهم کی ضمیر مجرور سے

علامہ حمید الدین فراہی کی تاویل کے مطابق سورہ فیل میں بھی یہی اسلوب اپنایا گیا ہے۔ (۱۵۰)

وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ (۳-۴)
 (اور اس نے ان پر جھنڈ کی جھنڈ چڑیاں بھیجیں اور حال یہ تھا کہ تو ان کے اوپر پتھر
 پھینک رہا تھا)

اس تاویل کے مطابق ترمیہم حال ہے علیہم کی ضمیر مجرور سے۔

۱۲۔ وصف

یہ کسی اسم کی خوبی یا خرابی بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ اس کی متعدد شکلیں اور فوائد ہیں:

۱۔ بسا اوقات کسی اسم کی صفت اس کے انجام کے اعتبار سے لائی جاتی ہے اگرچہ وہ انجام ابھی

پیش نہ آیا ہو۔ یہ عربی زبان کا عام اسلوب ہے۔ جریر اس اسلوب کو یوں استعمال کرتا ہے:

لولا الخليفة يا اخيطل ما نجا ايام دجلة شلوك الماكول (۱۵۱)

(اگر خلیفہ میدان دجلہ میں موجود نہ رہا ہوتا تو اے اخیطل تمہارے ریزہ ریزہ حصے نہ بچ پاتے)

یہاں شلوك الماكول میں الماكول کی صفت انجام اور نتیجے کے اعتبار سے آئی ہے ورنہ ظاہر

ہے کہ اخیطل میدان دجلہ سے صحیح سلامت واپس آیا تھا۔

اسی اسلوب کو قرآن نے بارہا استعمال کیا ہے۔ سورہ انفال میں کہتا ہے۔

لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا (۴۲)

(تا کہ اللہ اس کام کو کر دے جو کرنے کا تھا)

سورہ فیل میں ہے:

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ (۵)

(آخر انہیں ایسا کر دیا جیسے کھانے کا بھس)

یعنی اس مقابلہ میں اصحاب فیل کو ایسی شکست ہوئی کہ ان کی تمام طاقت پارہ پارہ ہو گئی اور

کچھ ہی دنوں کے بعد ان کی حکومت کی بھی دھجیاں اڑ گئیں۔ یہ تشبیہ عربی زبان میں بہت مستعمل

ہے۔ (۱۵۲) عدی بن زید اپنے مشہور قصیدہ میں کہتا ہے:

ثم صاروا كأنهم ورق جفّ فالوت به الصبا والدبور (۱۵۳)

(پھر وہ خشک پتیوں کی مانند ہو گئے جن کو پروا اور پچھوا ہوا اڑانے کے لیے پھرتی ہے)

۲۔ کبھی کبھی صفت بطور استدلال استعمال ہوتی ہے: سورہ آل عمران میں ہے:

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (۱۲۶)

(اور مدد صرف اس اللہ کی طرف سے ہوتی ہے جو زبردست ہے دانائے)

یعنی مدد صرف اللہ کی طرف سے آتی ہے اس لیے اہل ایمان کو مطمئن رہنا چاہیے کہ وہ ہمیشہ ان کی مدد کرے گا کیوں کہ وہ عزیز و غالب ہے جس کو چاہے فتح و غلبہ عطا فرمائے کسی کی مجال نہیں کہ اس کا ہاتھ پکڑ سکے لیکن ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اگر اہل ایمان کو کوئی افتاد پیش آجائے تو اس میں بھی کوئی حکمت کار فرما ہوتی ہے۔ اسی مضمون کو سورہ انفال میں اس طرح کھول کر بیان کیا ہے کہ اس سے اس کا استدلالی پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ فرمایا:

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۱۰)

(مدد جب بھی ہوتی ہے اللہ کی طرف سے ہوتی ہے یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے)

سورہ جمعہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (۱)

(اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو زمین و آسمان میں ہے، بادشاہ ہے نہایت مقدس، زبردست اور حکیم)

یہاں بھی خدائی صفات کا تذکرہ استدلال کے لیے ہے۔ یعنی کائنات کی ہر چیز خدا کے آگے سجدہ ریز اور اس کی تسبیح خواں ہے۔ اس لیے کہ وہ پوری کائنات کا تہا مالک، حاکم اور شہنشاہ ہے۔ تمام بشری لغزشوں اور خامیوں سے پاک ہے۔ مقتدر اور غالب ہے اور حکمت و دانائی والا ہے۔ سورہ صف میں ہے:

يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۱)

(اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو زمین اور آسمان میں ہے وہ زبردست اور دانا ہے)

اسی طرح سورہ حشر میں بھی اس مضمون کو کھول دیا گیا ہے:

يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۲۴)

(زمین و آسمان کی تمام چیزیں اس کی تسبیح کرتی ہیں۔ وہ زبردست اور دانا ہے)

سورہ حدید میں یہ استدلال مزید نمایاں ہو گیا ہے:

سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ لَهُ مُلْكُ

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ هُوَ

الأوّل وَالآخِر وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۱-۳)
 (اللہ کی تسبیح کی ہر اس چیز نے جو زمین اور آسمانوں میں ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے۔
 زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک وہی ہے۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے اور ہر
 چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہی اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی اور وہ
 ہر چیز کا علم رکھتا ہے)

۲۔ بسا اوقات صفت تخصیص کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سورہ بقرہ میں ہے:

قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقْرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بَكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ (۶۸)
 (موسیٰ نے کہا! اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا بلکہ
 اوسط عمر کی ہو)

قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقْرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاضِرِينَ (بقرہ: ۶۹)
 (موسیٰ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ زرد رنگ کی گائے ہونی چاہیے جس کا رنگ ایسا سرخ ہو کہ
 دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے)

إِنَّهَا بَقْرَةٌ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ
 فِيهَا (بقرہ: ۷۱)

(وہ ایسی گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی نہ زمین جوتی ہے نہ پانی کھینچتی ہے۔ صحیح
 و سالم اور بے داغ ہے)

گائے کی یہ ساری صفات دوسری گایوں سے ممتاز اور منفرد کرنے کے لیے اور تخصیص کے
 طور پر آئی ہیں جیسا کہ پوچھنے والوں کا اپنی شرارتوں کی وجہ سے مقصود تھا۔ یہی اسلوب سورہ تحریم کی
 اس آیت میں بھی ہے:

عَسَى رَبُّهُ إِنْ طَلَّقَكُنَّ أَنْ يُبَدِّلَهُ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِنْكُنَّ مُسْلِمَاتٍ
 مُؤْمِنَاتٍ فَنِيَّتٍ عَلَيْكِ سَائِحَاتٍ ثَيِّبَاتٍ وَأَبْكَارًا (۵)

(بعید نہیں اگر نبی تم سب بیویوں کو طلاق دے دے تو اللہ اسے ایسی بیویاں تمہارے
 بدلے میں عطا فرمادے جو تم سے بہتر ہوں سچی مسلمان، باایمان، اطاعت گزار، توبہ

گزار، عبادت گزار اور روزہ دار خواہ شوہر دیدہ ہوں یا باکرہ)

۴۔ کبھی کبھی صفت تاکید کے لیے آتی ہے۔ سورہ الحاقہ میں ہے:

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْحَةٌ وَاحِدَةٌ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ
فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً (۱۳-۱۴)

(پھر جب ایک مرتبہ صور میں پھونک ماری جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ریزہ
ریزہ کر دیا جائے گا)

سورہ یسین میں ہے:

مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ (۴۸)

(در اصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکہ ہے جو یکایک انہیں اس
حالت میں دھر لے گا جب یہ (اپنے دنیوی معاملات میں) جھگڑ رہے ہوں گے)

ان تمام آیات میں نفخۃ واحده، دکۃ واحده اور صیحة واحده میں صفات کا
استعمال تاکید اور زور پیدا کرنے کے لیے ہے۔

۵۔ بسا اوقات صفت عظمتوں اور خوبیوں کو نکھارنے کے لیے استعمال ہوتی ہے مثال کے طور
پر حضور اکرم کا فرمان ہے:

أَلَا أَخْبِرُكُمْ بِأَحْبَبِكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجَالِسَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ

أَحْسَنَ أَخْلَاقًا أَلْمُوطِئُونَ أَكْنَافًا الَّذِينَ يَأْلَفُونَ وَيُؤْلَفُونَ (۱۵۴)

(کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ قیامت کے دن مجھ سے سب سے زیادہ قریب اور میرے

نزدیک سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ جو تم میں اخلاق میں سب سے اچھے ہیں،

کندھوں کو پست رکھتے ہیں، جو محبت کرتے ہیں اور ان سے محبت کی جاتی ہے)

حضرت عباس بن عبدالمطلب حضور کی مدح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وَأَبْيَضُ يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ شِمَالُ الْيَتْمَى عَصِمَةَ لِلْأَرَامِلِ (۱۵۵)

(وہ گورے مکھڑے والا جس کے روئے زیبا کے واسطے سے ابر رحمت کی دعائیں مانگی جاتی

ہیں! وہ یتیموں کا سہارا، وہ بیواؤں اور مسکینوں کا سرپرست)

حضرت حسان بن ثابت کا مشہور شعر ہے:

بَيْضُ الْوَجْهِ كَرِيمَةَ أَحْسَابِهِمْ شَتْمُ الْأَنْوْفِ مِنَ الطَّرَازِ الْأُولَى (۱۵۶)

اور سب سے سے بہترین مثال سورہ حشر کا آخری رکوع ہے:

هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمَنُ
الرَّحِيمُ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ
الْمُهَيِّمُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ - سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ - هُوَ
اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ - (۲۲-۲۴)

(وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا ہے۔
وہی رحمان و رحیم ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بادشاہ ہے نہایت
مقدس ہے سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، سب پر غالب، اپنا حکم بزور نافذ
کرنے والا اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا ہے۔ پاک ہے اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں۔
وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق
صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمان و زمین میں
ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے)

یہ ساری صفات خدائے وحدہ لا شریک کی عظمت و تقدیس ظاہر کرنے کے لیے ہیں۔

۶- صفت مذمت اور تحقیر کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر حدیث نبوی ہے:

أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِابْغَضِكُمْ إِلَيَّ وَ أْبَعْدَ كُمْ مِنِّي مَجَالِسَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ
أَسَاؤُكُمْ أَخْلَاقًا الثَّرَثَارُونَ الْمَتَفِيهِقُونَ - (۱۵۷)

(کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ میرے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور قیامت کے روز
سب سے زیادہ دوری پر کون لوگ ہوں گے جو سب سے زیادہ بد اخلاق، بڑے بولنے
والے باتونی اور گھمنڈ جتانے والے ہیں)

سورہ قلم میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تُطِيعُ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ هَمَّازٍ مَّشَاءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ
أَيْمٍ عَتَلٍ بَعْدَ ذَلِكَ زَنِيمٍ - (۱۰-۱۳)

(ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت زیادہ قسمیں کھانے والا ہے بے وقعت آدمی ہے،

طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے، ظلم و زیادتی میں حد سے گذر جانے والا ہے، سخت بد اعمال ہے، جفاکار ہے، اور ان سب عیوب کے ساتھ بد اصل ہے) ان آیات میں ساری صفات تحقیر اور مذمت کے لیے استعمال ہوئی ہیں اور کلام عرب میں خاص طور سے ہجو یہ قصاید میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔

۷۔ بسا اوقات اسم کی جگہ صرف صفت کا استعمال ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ ملک میں ہے:

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ - (ملك : ۱۴)

(کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے۔ وہ تو بڑا ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے)

سورہ مرسلات میں ہے:

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا فَالْعَصْفِ عَصْفًا وَالنَّشِرَاتِ نَشْرًا فَالْفَرْقَتِ
فَرَقًا فَالْمُلْقِيَتِ ذِكْرًا عُذْرًا أَوْ نَذْرًا (۱-۶)

(شاید ہیں ہوائیں جن کی باگ چھوڑ دی جاتی ہے پس وہ اڑاتی ہیں غبار اندھا دھند اور شاہد ہیں ہوائیں پھیلانے والی بادلوں کو، پھر وہ معاملہ کرتی ہیں جدا جدا پھر ڈالتی ہیں یاد دہانی اتمام حجت کے طور پر یا آگاہ کر دینے کو)

یہاں موصوف کا تذکرہ نہیں ہے اسی وجہ سے بعض لوگوں نے ملائکہ کو مراد لیا ہے۔ (۱۵۸)

اسی طرح سورہ العادیات میں دیکھیے:

وَالْعَدِيَّتِ صُبْحًا فَالْمُورِيَّتِ قَدْحًا فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا فَأَثَرُنَ بِهِ نَقْعًا
فَوْسَطْنَنَ بِهِ جَمْعًا (۱-۵)

(گواہی دیتے ہیں ہانپنے، دوڑنے والے گھوڑے، ٹاپوں کی ٹھوک سے چنگاریاں نکالنے والے، صبح کے وقت دھاوا کرنے والے دوڑ سے غبار اٹھانے والے اور غبار کے ساتھ غول میں گھس جانے والے)

یہاں بھی موصوف محذوف ہے یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس سے مزدلفہ کے

اوشبہ مراد لیے ہیں۔ (۱۵۹)

۱۵۔ اعتراض

یعنی دوران گفتگو کوئی ایک ایسا لفظ یا جملہ استعمال کر لیا جائے جس کے بغیر بھی گفتگو مکمل ہو سکتی ہو۔ لیکن اسے کسی فائدہ کے پیش نظر درمیان کلام لے آیا گیا ہو۔ بقول سیوطی ”اعتراض اس بات کا نام ہے کہ ایک کلام یا دو کلاموں کے مابین دفع ابہام کے سوا کسی اور نکتہ کے لیے ایک جملہ یا ایک سے زیادہ جملے اس طرح لائے جائیں جن کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو“ (۱۶۰) طیبی نے کتاب التبیان میں لکھا ہے کہ حسین اعتراض کی وجہ بہتر فائدہ دینا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا آنا ایک غیر مترقب چیز کا آنا ہے لہذا وہ اس وقت ایک ایسی خوبی کی مانند ہوگی جو نامعلوم طور پر یا ایسی سمت سے جہاں سے اس کی آمد کی خبر بھی نہ ہو خود بخود آجائے اور مقصد حاصل ہو جائے۔ (۱۶۱)

یہ اسلوب کلام عرب میں بہت مستعمل ہے۔ نابغہ ذبیانی کا مشہور شعر ہے:

لعمری و ما عمری علیٰ بہینٍ لقد نطقت بطلاً علیٰ الأقرع (۱۶۲)
(خدا کی قسم۔ اور میرا قسم کھانا کوئی آسان اور معمولی چیز نہیں ہے۔ بنو قریع بن عوف نے ہمارے خلاف غلط باتیں کہی ہیں)

کثیر کہتا ہے:

لو أن الباخلین و انت منہم رأوک تعلموا منک المطالا (۱۶۳)
(اگر بخل کرنے والے۔ اور تم بھی انہیں میں سے ہو۔ تم کو دیکھ لیتے تو تم سے ٹال مٹول کی صفت سیکھ لیتے)

اعتراض کی بہترین مثال وہ شعر ہے جو کسی نے عبد اللہ بن طاہر کی شان میں کہا ہے:

إن الثمانین و قد بلغتھا قد أحوجت سمعی الی ترجمان (۱۶۴)
(اسی سال کی عمر نے۔ اور تم بھی اسی عمر کو پہنچ گئے ہو۔ میرے کانوں کو ترجمان کا حاجت مند بنا دیا ہے)

نابغہ کے شعر میں و ما عمری علیٰ بہین (اور میرا قسم کھانا کوئی آسان اور معمولی چیز نہیں ہے) جملہ معترضہ ہے۔ بات صرف اتنی کہنی تھی کہ بنو قریع نے نعمان کی خدمت میں میری جو چغلی کھائی ہے اور الٹی سیدھی باتیں کہی ہیں وہ بخدا غلط ہیں۔ لیکن اس جملہ کے اضافے نے مقسم

بہ کی اہمیت و افادیت کو واضح کر دیا۔

اسی طرح کثیر کے شعر میں اصل کلام صرف اتنا ہے کہ کنجوس لوگ اگر تمہیں دیکھ لیں تو ٹال مٹول اور لیت و لعل کی تمہاری پالیسی سیکھ لیں لیکن و انت منہم کے جملہ معترضہ نے مفہوم کے اندر مزید زور اور تاثیر پیدا کر دی اور مخاطب کی صحیح تصویر نگاہوں کے سامنے آگئی۔ یہی حال تیسرے شعر کا بھی ہے اس میں و قد بلغتہا جملہ معترضہ ہے۔

قرآن پاک میں اس اسلوب کی نظیریں بہت ہیں۔ چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ نَسَبًا و لَقَدْ عَلِمْتِ الْجَنَّةَ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ
سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلِصِينَ۔ (صافات: ۱۵۸-۱۶۰)

(اور انہوں نے خدا اور جنوں کے درمیان بھی رشتہ جوڑ رکھا ہے اور جنوں کو خوب پتہ ہے کہ وہ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں بجز ان کے جو اللہ کے خاص بندے ہیں)

ان آیات میں سبحن اللہ عما یصفون بطور جملہ معترضہ ہے اور إلا عباد اللہ المخلصین کا تعلق و لقد علمت الجنة انہم لمحضرون سے ہے۔ قرآن میں متعدد نظیریں موجود ہیں کہ جب کسی بات کی فوری تردید کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو تردید اصل سلسلہ کلام کے بیچ آجاتی ہے اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ بات ایسی گھنونی ہے کہ متکلم کو اس کی تردید کے معاملہ میں اتنا توقف بھی گوارا نہیں کہ اس کی بات پوری ہو لے۔

یہاں یہ بات انتہائی شنیع اور گھناؤنی تھی کہ جنات کو خدا کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ اس وجہ سے بلا توقف اس کی تردید فرمادی کہ خدا کی ذات و صفات اس کی تمام نسبتوں سے پاک ہے نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے نہ صفات میں؛ وہ بالکل وحدہ لا شریک ہے اس وجہ سے وہ اپنے حقوق میں بالکل یکتا و لا شریک ہے۔ (سورہ روم میں فرمایا:

فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَ حِينَ تُصْبِحُونَ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي

السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ وَ عَشِيًّا وَ حِينَ تُظْهِرُونَ (روم: ۱۷-۱۸)

(پس اللہ ہی کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے اور جس وقت صبح کرتے ہو اور آسمانوں اور زمین

میں اسی کی حمد ہو رہی ہے اور عشاء کے وقت بھی اور اس وقت بھی جب تم ظہر کرتے ہو)

یہاں اوقات تسبیح کے درمیان ولہ الحمد فی السماوات والأرض ایک جملہ معترضہ

ہے جو بطور تنبیہ و تذکیر وارد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہی کی تسبیح کی جو دعوت دی جا رہی ہے یہ کوئی

بیگانہ دعوت نہیں ہے بلکہ آسمانوں اور زمین کے ہر گوشے سے خدا ہی کی حمد کا ترانہ گونج رہا ہے اس لیے جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کر رہے ہیں ان کا سراسر کائنات کے مجموعی سر سے بالکل بے جوڑ ہے۔ دوسری طرف دعوت کا انکار کرنے والوں سے ایک قسم کی بیزاری کا اظہار بھی ہے۔

سورہ انعام میں فرمایا:

وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهُ بَنَاتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ سُبْحٰنَهُ وَتَعَالٰی عَمَّا يَصِفُوْنَ (انعام: ۱۰۰)

(اور انہوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالاں کہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور اس کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں)

یہاں و خلقہم کی حیثیت کلام کے بیچ میں جملہ معترضہ کی ہے یہ بات اتنی گھناؤنی تھی کہ بلا تاخیر اس کی تردید فرمادی کہ یہ لوگ جنوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں حالاں کہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا ہے۔ خدا ہی کی مخلوق آخر اس کی خدائی میں شریک کیسے بن سکتی ہے؟ سورہ واقعہ میں فرمایا:

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّو تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِيْ كِتَابٍ مَّكْنُونٍ (واقعہ: ۷۵-۷۸)

(پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے گرنے کے ٹھکانوں کی! اور بے شک یہ ایک بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو! بے شک یہ ایک باعزت قرآن ہے ایک محفوظ کتاب میں)

یہاں فلا أقسم بمواقع النجوم کے بعد و إنہ لقسم لو تعلمون عظیم قسم اور مقسم علیہ کے درمیان ایک بر محل جملہ معترضہ ہے۔ فرمایا کہ اگر تم جان سکو تو یہ حقیقت تم پر آشکارا ہوگی کہ یہ قسم اپنے اندر ایک عظیم شہادت اس بات کی رکھتی ہے کہ جنات و شیاطین کو ملا اعلیٰ تک کوئی رسائی حاصل نہیں ہے۔ سورہ لقمان میں فرمایا:

وَ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ وَفِصْلُهُ فِىْ عَامَيْنِ أَنْ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ إِلَى الْمَصِيْرِ (لقمان: ۱۴)

(اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملہ میں ہدایت کی، اس کی ماں نے دکھ پر دکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا کہ میرے شکر گزار رہو اور اپنے والدین کے، میری ہی طرف بالآخر لوٹنا ہے)

اس آیت میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی جب وصیت کی گئی تو جملہ معترضہ کے طور

پر بچے کی پیدائش اور تربیت میں ماں کی کلفتوں اور پریشانیوں کا تذکرہ بھی کر دیا تاکہ ماں کی فضیلت اور مقام و مرتبہ کا بچے کو پوری طرح احساس ہو اور اس کی اطاعت میں بچے کو ناگواری کا احساس نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں ماں کا درجہ سب سے اونچا قرار دیا گیا ہے اور حسن سلوک اور حسن معاشرت کا سب سے زیادہ حقدار ماں کو بتایا گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں دیکھیے:

وَ إِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادْرَأْتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ۔ (بقرہ: ۷۲)
(اور یاد کرو جب کہ تم نے ایک نفس کو قتل کر دیا پھر اس کے بارے میں ایک دوسرے پر الزام بازی کی حالاں کہ اللہ وہ سب کچھ ظاہر کرنے والا ہے جو چھپاتے رہے ہو)

اس آیت میں واللہ مخرج ما کنتم تکتمون بطور جملہ معترضہ کے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو قتل کر کے تم دنیا میں ایک دوسرے پر الزام بازی کر کے اس کو چھپانے کی کوشش کر سکتے ہو حالاں کہ یاد رکھو کہ کوئی چیز اگر تم نے دنیا میں چھپالی تو وہ ہمیشہ مخفی نہیں رہے گی بلکہ ایک دن اللہ وہ سب کچھ ظاہر کر کے رہے گا جو تم چھپا رہے ہو۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ چھوٹے جملے بھی اعتراض کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور طویل مضامین بھی البتہ سب ماقبل و مابعد سے مربوط ہوتے ہیں مثال کے طور پر سورہ اعراف میں دیکھیے:

حضرت موسیٰ کی داستان بیان ہو رہی ہے اور اس عہد و میثاق کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل سے آئندہ آنے والے انبیاء پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا۔ فرمایا:

قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ وَ رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ
فَسَاكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَ يُوْتُونَ الزَّكَاةَ وَ الَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا
يُؤْمِنُونَ (اعراف: ۱۵۶)

(فرمایا میں اپنے عذاب میں تو اسی کو مبتلا کرتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو عام ہے سو میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے)

اس کے بعد آگے کی آیت ۱۵۷ میں بطور اعتراض اس امر کی بھی تصریح کر دی کہ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ کے مصداق کون لوگ ہیں فرمایا:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا فِي
التَّوْرَةِ وَ الْإِنْجِيلِ وَ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَ يَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ
وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَاتَّبَعُوا
النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ - (۱۵۷)

(جو پیروی کریں گے اس نبی امی رسول کی جسے وہ اپنے یہاں تورات وانجیل میں لکھا ہوا
پاتے ہیں۔ وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں جائز
ٹھہراتا ہے اور خبیث چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں اتارتا ہے جو
ان پر اب تک رہی ہیں تو جو اس پر ایمان لائے، جنہوں نے اس کی مدد کی اور اس روشنی کی
پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں)
اور جب بات بنی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر تک پہنچ گئی تو برسر موقع بطور جملہ معترضہ آپ
کی زبان مبارک سے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی دعوت بھی دلوادی گئی:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَ
رَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُونَ - (۱۵۸)

(کہہ دو، اے لوگو، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں اس اللہ کا جس کے
لیے ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور
اس کے نبی امی رسول پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو
تاکہ تم راہیاب ہو)

لیکن اس کے بعد آیت ۱۵۹ سے پھر اصل مضمون شروع ہو گیا اور موسیٰ کی داستان کا سلسلہ
قائم ہو گیا۔

اسی طرح سورہ مریم میں دیکھیے۔ ۱۶ سے ۳۳ تک حضرت مریم علیہا السلام کی سرگذشت
بیان ہوئی ہے اس کے بعد دو آیات حضرت مسیح کے ارشادات کے درمیان میں اللہ تعالیٰ کی طرف
سے بطور جملہ معترضہ ہیں۔ فرمایا:

ذَلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ مَا كَانَ لِلَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ
مِنْ وُلْدٍ سُبْحَانَهُ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ - (۳۴، ۳۵)

(یہ ہیں عیسیٰ ابن مریم۔ یہ اصل حقیقت بیان ہوئی ہے جس میں یہ لوگ جھگڑ رہے ہیں۔

خدا کے شایان نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے، وہ پاک ہے۔ جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس کو فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے)

یعنی عیسیٰ ابن مریم کی اصل حقیقت وہ ہے جو اللہ نے بیان فرمائی اور خود حضرت مسیح نے واضح کر دی لیکن عیسائیوں نے اسے افسانہ و ناول بنا دیا اور خود بھی اوہام و خرافات میں مبتلا ہوئے اور دوسروں کو بھی مبتلا کیا۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰ کے ارشادات کا آخری ٹکڑا نقل ہوا ہے۔

سورہ بقرہ میں آیات ۲۴۳ تا ۲۸۳ میں مسلمانوں کو خانہ کعبہ کی آزادی کے لیے جہاد پر ابھارا گیا ہے اور اس جہاد کے مقصد سے انفاق کا جذبہ بھڑکایا گیا ہے۔ بنی اسرائیل نے اپنے قبلہ کو فلسطینیوں سے آزاد کرانے کے لیے جو جنگ لڑی اس کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن درمیان میں اصل سلسلہ کلام کو روک کر بطور اعتراض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا:

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ تَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنْ اِخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ (بقرہ: ۲۵۲، ۲۵۳)

(یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں سناتے ہیں مقصد کے ساتھ اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو۔ یہ رسول جو ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ان میں سے بعض سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجے بلند کیے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے واضح دلائل کے بعد نہ لڑتے لیکن انہوں نے اختلاف کیا۔ سو ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ اختلاف نہ کر پاتے لیکن اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے) اس کے بعد انفاق کا مضمون از سر نو آ گیا ہے۔

یہاں اس اعتراض کا فائدہ یہ ہوا کہ رسولوں کی صحیح حیثیت متعین ہو گئی اور اس صحیح رویے کی وضاحت ہو گئی جو ان خدائی پیغمبروں کے بارے میں ان کی امتوں کو اختیار کرنا تھا۔

۱۶- تکمیل

یعنی متکلم کوئی بات محتاط اور معتدل انداز میں کہے لیکن اس سے بات پوری ہوتی نظر نہ آرہی ہو یا کوئی التباس ہو رہا ہو اور مخاطب کے شبہ میں مبتلا ہونے یا غلط مفہوم سمجھ لینے کا اندیشہ ہو تو وہ اس کی وضاحت کر کے بات کو مکمل کر دے اس کو احترام بھی کہا جاتا ہے۔ علامہ سیوطی کے الفاظ میں تکمیل یہ ہے کہ ایسے کلام میں جو خلاف مقصود ہونے کا وہم پیدا کرتا ہو، کوئی ایسی بات بیان کی جائے جو اس وہم کو ختم کر دے۔ (۱۶۶) کلام عرب میں اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔
متنبی کہتا ہے:

إني أصاحب حلمي و هو بي كرم ولا أصاحب حلمي و هو بي جبن (۱۶۷)
(میں حلم و بردباری اختیار کرتا ہوں جب کہ اس سے سخاوت پھوٹتی ہو لیکن اگر اس سے بزدلی آشکارا ہو تو میں حلم کا دامن چھوڑ دیتا ہوں)
اس مثال میں دوسرا شعر ایک غلط فہمی دور کرنے کے لیے وارد ہوا ہے۔
عبداللہ بن معمر گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے:

صبينا عليها ظالمين سياطنا فطارت بها ايد سراع وارجل (۱۶۸)
(ہم نے اپنے گھوڑوں پر کوڑے برسائے حالاں کہ ہمارا یہ فعل سراسر ظلم تھا چنانچہ تیز رفتار ہاتھ پاؤں انھیں لے کے اڑ گئے)

اس شعر میں اگر ظالمین کو نکال دیا جائے تو سماع کو یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ شاعر کے گھوڑے کند ذہن اور ست رفتار تھے حالاں کہ شعر کا مقصود یہ نہ تھا چنانچہ ظالمین کے ذریعہ اس غلط فہمی کو دور کر دیا گیا۔
عنترہ کہتا ہے:

يخبرك من شهد الواقعة أني أغشى الوغى و أعف عند المغنم (۱۶۹)
(جو لوگ میدان جنگ میں موجود رہے ہیں وہ تمہیں بتائیں گے کہ میں جنگ کے میدان میں

کو دپڑتا ہوں لیکن مال غنیمت سے دور رہتا ہوں کیوں کہ میں اس کی خاطر جنگ نہیں کرتا)
اس شعر میں و اَعْفُ عِنْدَ الْمَغْنَمِ احتراس یا تکمیل کے طور پر وارد ہوا ہے اور مقصد اس
امر کی تردید ہے کہ شاعر جنگ میں مال غنیمت کی خاطر شجاعت کے جوہر دکھائے۔
محمد بن کعب غنوی کہتا ہے:

حَلِيمٌ إِذَا مَا الْحَلْمُ زَيْنٌ أَهْلُهُ مَعَ الْحَلْمِ فِي عَيْنِ الرِّجَالِ مَهِيْبٌ (۱۷۰)
(وہ بردبار ہے جب کہ بردباری انسان کی زینت میں اضافہ کرتی ہو اور افراد کی نگاہ میں وہ
خوفناک بھی ہے)

یہاں فی عین الرجال مہیب کے جملہ نے ہر وہم کو دور کر دیا کہ یہ حلم و بردباری کسی
کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی شرافت طبع کی پیداوار ہے ورنہ وہ خطرناک اور خوفناک بھی ہے۔
قرآن نے اس اسلوب کو نہایت عمدگی سے استعمال کیا ہے۔ سورہ مائدہ میں کہتا ہے:
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ
بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ -
(مائدہ: ۵۴)

(اے ایمان والو، جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ کو کوئی پروا نہیں، وہ جلد
ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے وہ
مسلمانوں کے لیے نرم مزاج اور کافروں کے مقابلے میں سخت ہوں گے۔)

ایک حدیث میں ہے کہ المؤمن غرّ کریم یعنی مومن اپنے دوسرے بھائی کے لیے بھولا
بھالا اور شریف و کریم ہوتا ہے وہ مسلمانوں کے لیے نرم خو، نرم مزاج اور ہر پہلو سے لچک قبول کرنے
والا اور ہر سانچے میں ڈھل جانے والا ہوتا ہے لیکن کوئی اس سے یہ نہ سمجھے کہ وہ اسلام دشمنوں کے
ہاتھوں میں موم کی ناک اور کٹھ پتلی ثابت ہو گا اور وہ جس طرح چاہیں گے اس کو موڑیں گے اور
جس طرح اس کو چاہیں گے نچائیں گے بلکہ کفر اور باطل کے مقابلے میں وہ پتھر کی چٹان ہو گا وہ اگر
اپنے اغراض و مقاصد کے لیے اسے استعمال کرنا چاہیں گے تو کہیں سے انگلی دھنسانے کی جگہ نہ
پاسکیں گے۔ یہاں أعزّة علی الکافرین کی صفت تکمیل کے لیے یا احتراس کے لیے آئی ہے۔
یہی بات سورہ فتح میں بھی بیان ہوئی ہے اور وہاں بھی یہی اسلوب کار فرمایا ہے۔ فرمایا:

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ

(فتح: ۲۹)

(محمد اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحمدل ہیں)
یہاں رحماء بینہم کے ذریعے اس امر کی وضاحت ہو گئی کہ ان کی یہ سختی اور فولادیت باطل کے خلاف ہے آپس میں تو وہ بالکل نرم اور سہل الانقیاد ہیں، سیدنا مسیح نے اپنے ساتھیوں کو یہ جو ہدایت فرمائی تھی کہ کبوتر کی مانند بے آزار اور سانپ کی مانند ہوشیار بنو اس میں بھی یہی دونوں پہلو ملحوظ تھے۔

سورہ طہ میں ہے:

وَاضْمُمُ يَدَكَ إِلَى جَنَاحِكَ تَخْرُجُ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَى

(طہ: ۲۲)

(اور اپنے ہاتھ کو اپنے بازو کی طرف سکیڑ لو، وہ وہاں سے ایک دوسری نشانی بن کر، چٹا سفید، بغیر کسی مرض کے برآمد ہوگا)

یہاں بیضاء کے ساتھ من غیر سوء کی قید نہ ہوتی تو تورات کی اس روایت کی تردید نہ ہو پاتی کہ جب حضرت موسیٰ نے اپنا ہاتھ نکالا تو وہ برص سے سفید نکلا۔ من غیر سوء کے اس اضافہ نے اس روایت کو بے بنیاد قرار دے دیا اور اس امر کی صراحت ہو گئی کہ ہاتھ کی یہ سفیدی کسی مرض کے سبب سے نہ ہوگی بلکہ اللہ کی ایک نشانی کے طور پر ہوگی۔

سورہ نمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی سرگذشت بیان ہوئی ہے کہ جب حضرت سلیمان کی فوجیں مارچ کرتی ہوئی چیونٹیوں کی وادی میں پہنچیں تو ایک چیونٹی نے اپنے دل کو خطرے سے آگاہ کیا کہ اے چیونٹیو! اپنی بلوں میں گھس جاؤ مبادا سلیمان اور اس کی فوجیں بے خبری میں تمہیں پامال کر دیں۔

حَتَّىٰ إِذَا أَتَوْا عَلَىٰ وَادِي النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمُنُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (نمل: ۱۸)

(یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے، ایک چیونٹی نے کہا، اے چیونٹیو!

اپنے سوراخوں میں گھس جاؤ کہ سلیمانؑ اور ان کا لشکر تمہیں بے خبری میں پامال نہ کر ڈالے) یہاں وہم لا یسعون کے اضافہ نے حضرت سلیمانؑ کی جانب ظلم کے توہم کو ختم کر دیا۔ اسی طرح سورہ منافقون میں ہے:

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ (۱)

(جب منافق تمہارے پاس آتے ہیں، کہتے ہیں، ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک تم اس کے رسول ہو اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین بالکل جھوٹے ہیں)

یہاں وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ کا جملہ احترام کے طور پر وارد ہوا ہے تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو سکے کہ تکذیب کی زد خود نفس مضمون پر پڑ رہی ہے۔ یہ منافقین اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں لیکن جہاں تک تمہارے رسول ہونے کا تعلق ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان کی شہادت کی محتاج نہیں ہے۔ اللہ کو خوب علم ہے کہ تم اس کے رسول ہو البتہ یہ منافقین اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں کیوں کہ ان کا طرز عمل ان کی شہادت کے بالکل خلاف ہے۔

سورہ تغابن میں فرمایا:

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ (۱۵)

(تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے فتنہ ہیں اور اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے)

یہاں وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ کے اضافہ نے اس وہم کو دور کر دیا کہ مال و اولاد سے یکسر قطع تعلق اور مفارقت کی روش اختیار کی جائے فرمایا کہ جس حد تک گنجائش ہو عفو و درگزر اور چشم پوشی سے کام لیا جائے اور مال و اولاد کو خدا کی راہ میں لگایا جائے کہ اسی میں فوز و فلاح ہے یہ راہ اختیار کر کے اس دنیا میں کوئی نقصان بھی اٹھاو گے تو اطمینان رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر نقصان کی تلافی آخرت میں اجر عظیم سے فرمائے گا۔

۱۷- عطف بالواو

اس عطف کے عمومی فوائد تو نحو کی کتابوں میں ملیں گے البتہ یہاں کچھ خاص فوائد اور حکمتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو عام اصولوں سے ہٹ کر ہیں تاکہ اس اصول کے بعض اسرار و حکم کا تجزیہ ہو سکے جو غور و تدبر سے سامنے آتے ہیں۔

۱- اس عطف کا ایک فائدہ تو صیح و تبیین ہے یعنی یہ معطوف علیہ کی وضاحت کے لیے آتا ہے مثال کے طور پر سورہ توبہ میں فرمایا گیا:

وَ إِذَا أَنْزَلْتُ سُورَةً أَنْ آمَنُوا بِاللَّهِ وَ جَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ
أُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُنْ مَعَ الْقَاعِدِينَ۔ (۸۶)

(اور جب کوئی سورہ نازل ہوتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کے لیے نکلو تو ان میں کے جو مقدرت والے ہیں وہ بھی تمہارے پاس رخصت مانگنے آکھڑے

ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجیے ہم بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ رہیں گے)

اس آیت میں وجہاد و مع رسولہ ، آمنا باللہ کی عملی توضیح ہے یعنی جب کوئی حصہ

قرآن ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اللہ کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کے لیے نکلو تو یہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔

دوسرے ٹکڑے میں وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُنْ مَعَ الْقَاعِدِينَ تشریح و توضیح ہے اسْتَأْذَنَكَ کی

یعنی مقدرت اور مال والے اور توانا جسم رکھنے والے اور سامان جنگ فراہم کرنے کا وافر ذریعہ رکھنے

والے اجازت طلب کرنے لگتے ہیں یعنی وہ نکلنے والے غازیوں کا ساتھ نہیں دینا چاہتے بلکہ بیٹھ

رہنے والے بزدلوں ناکارہ لوگوں اور معذوروں کے ساتھی بننا چاہتے ہیں اور طرح طرح کے بہانے

تراش کر رخصت مانگنے آ موجود ہوتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ ذُرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ

مُؤْمِنِينَ (۲۷۸)

(اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور جو سود تمہارا باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم سچے مومن ہو)

اس آیت میں و ذروا ما بقی من الربوا عملی تفسیر ہے اتقوا اللہ کی۔ اہل ایمان کو براہ راست خطاب کر کے اللہ سے ڈرتے رہنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جس کی عملی تفسیر یہ بتائی گئی کہ جو کچھ سود رہ گیا ہے اس سے دست بردار ہو جاؤ کیوں کہ یہ چیز تقویٰ کے منافی ہے اور پھر آگے کی آیت میں یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اب جو لوگ اس حکم کو نہ مانیں گے وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جائیں۔

عطف کا یہ اسلوب سورہ توبہ میں بھی دیکھیے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (۱۱۹)

(اے ایمان والو، اللہ سے ڈرتے رہو اور راست بازوں کی معیت اختیار کرو)

یہاں بھی آخر کا جملہ معطوف علیہ کی توضیح کے لیے ہے یعنی اللہ سے ڈرو جس کا تقاضہ یہ ہے کہ کافروں، جاہلوں اور منافقوں کی معیت اختیار کرنے کے بجائے راست بازوں کی صحبت و معیت اور راسخ الایمان اور کامل الحیاء لوگوں کی رفاقت اختیار کرو۔ ہمارے اس قول کی وضاحت بعد کی دو آیات سے بخوبی ہو جاتی ہے فرمایا:

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنِ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَفْسِهِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوِّ نَيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ وَلَا يَنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (توبہ : ۱۲۰، ۱۲۱)

”اہل مدینہ اور اس کے گرد و نواح کے اعراب کے لیے روانہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر پیچھے بیٹھ رہیں اور نہ یہ کہ اپنی جان کو اس کی جان سے عزیز رکھیں، یہ اس لیے کہ جو پیاس، تکان اور بھوک بھی خدا کی راہ میں ان کو لاحق ہوتی ہے اور جو قدم بھی وہ کفار کو رنج پہنچانے والا اٹھاتے ہیں اور جو چرکا بھی کسی دشمن کو لگاتے ہیں، ان سب کے بدلے میں ان کے لیے ایک نیکی لکھی جاتی ہے اللہ خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا اور جو کوئی چھوٹا یا بڑا نفاق وہ کرتے ہیں اور جو وادی بھی وہ قطع کرتے ہیں، سب ان کے لیے لکھا جاتا ہے تاکہ اللہ ان کے عمل کا اچھے سے اچھا بدلہ دے۔“

۲۔ عطف کا ایک فائدہ یہ ہے کہ معطوف میں نتیجہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے:

رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَ طَبَعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ (توبہ: ۸۷)

(انہوں نے اس بات کو پسند کیا کہ پیچھے رہ جانے والیوں کے ساتھی بنیں اور ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے تو اب وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں)

یعنی ان منافقوں نے غازیوں کی ہم سفری وہم رکابی کے بجائے عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھ رہنے کو ترجیح دی تو ان کی اس اخلاقی و ایمانی موت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دلوں پر ٹھپہ لگادیا گیا نہ اب وہ کوئی صحیح بات سوچتے ہیں نہ کسی عزم و ہمت والے کام کے لیے ان میں حوصلہ ہی پیدا ہوتا ہے اسی مفہوم کو آگے آیت ۹۳ میں پھر دہرایا گیا ہے:

رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (توبہ: ۹۳)

(یہ لوگ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ بیٹھے رہنے پر راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی پس وہ علم سے محروم ہو گئے)

۳۔ جب شرط اور جواب شرط میں کمال اتصال دکھانا مقصود ہو تو جواب شرط پر حرف عطف واو داخل کر دیتے ہیں یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ان دونوں افعال میں کوئی وقفہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سورہ صفت میں فرمایا:

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَ تَلَّ لِلْجَبِينِ (۱۰۳)

(پس جب دونوں نے اپنے تئیں اپنے رب کے حوالے کر دیا اور ابراہیم نے اس کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا)

یہاں و تله للجبین اصل میں لما کا جواب ہے لیکن شرط اور جواب شرط میں کمال اتصال کا مظاہرہ کرنے کے لیے عام قاعدے سے ہٹ کر واو حرف عطف داخل کر دیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت ابراہیم نے پیشانی کے بل پچھاڑنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی بلکہ فوراً رضائے الہی کی طلب کے لیے بے قرار ہو کر یہ مبارک اقدام کر ڈالا۔ (۱۷۱)

اسی طرح سورہ زمر میں فرمایا:

وَسِيْقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَ

فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا
خَالِدِينَ (زمر: ۷۳)

(اور جن لوگوں نے اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی گذاری وہ گروہ در گروہ جنت کی
طرف لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے تو اس کے
دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے پاسبان سلام کے ساتھ ان کا خیر مقدم کریں
گے کہ مبارک ہو اس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جائے)

یہاں و فتحت ابوابها جواب شرط ہے إذا کا (۱۷۲)۔ لیکن اس پر واوداغل کر دیا ہے یہ
بتانے کے لیے کہ جنتیوں اور جنت کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوگی وہ پہنچیں گے تو جنت اپنی
تمام جلوہ طرازیوں اور آرائشوں کے ساتھ استقبال کے لیے موجود ہوگی۔

۴۔ علت: کہیں کہیں واو عطف علت اور سبب بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثال کے
طور پر سورہ اعراف کی یہ آیت دیکھیے:

فَالْيَوْمَ نُنَسِّاهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَذَا وَمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا
يَجْحَدُونَ (اعراف: ۵۱)

(آج بھی ہم انہیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح وہ اس دن کی ملاقات کو بھولے
رہے اور بسبب اس کے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے)

یہاں و ما کانوا بآیاتنا یجحدون سبب بتانے کے لیے آیا ہے (۱۷۳) یعنی ہم انہیں
آج اس لیے نظر انداز کر رہے ہیں کہ انہوں نے دنیوی زندگی میں لہو و لعب کیا، آخرت کے دن کو
بھولے رہے اور ہماری آیات کا مسلسل انکار کرتے رہے اس لیے آج قیامت کے دن یہ کسی رعایت
کے مستحق نہیں ہیں۔

اس آیت کے پہلے ٹکڑے میں فرمایا ہے:

الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَ لَعِبًا وَ غَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا (اعراف: ۵۱)

(جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنایا اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا)

یہاں واو سیبہ ہے یعنی معطوف میں اس لا ابالیانہ طرز عمل کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ وہ کیوں
ٹھوس حقائق سے منہ چرائے رہے فرمایا کہ دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں رکھا۔ انہوں نے اسی
دنیا کی زیب و زینت کو سب کچھ سمجھ لیا اور اگر کسی نے انہیں یوم آخرت کی طرف توجہ دلائی تو اسے
دیوانہ اور خبطی کہہ دیا اور پھر اپنی خرمستیوں میں یہ کہتے ہوئے جا پڑے کہ ”بازی بازی بار لیش بابا ہم بازی“۔

۱۸- ابہام کے بعد توضیح

یہ اسلوب قرآن پاک اور کلام عرب میں بہت عام ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مخاطب کو اپنی طرف متوجہ کرنے یا اسے ورطہ حیرت میں ڈالنے کے لیے کسی چیز کا مبہم تذکرہ کیا جاتا ہے اور جب مخاطب کے اندر تجسس پیدا ہو جاتا ہے تو فوراً اس کی تفصیل کر دی جاتی ہے تاکہ اس کی حیرانی و سرگشتگی دور ہو سکے اس سے اس چیز کی اہمیت و افادیت بھی سامنے آ جاتی ہے۔ اس اسلوب کے متعدد فوائد ہیں۔

اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ معنی و مفہوم مبہم و واضح دو مختلف صورتوں میں سامنے آ جاتا ہے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مفہوم دل میں بیٹھ جاتا ہے کیوں کہ مشقت اور اشتیاق کے بعد حاصل ہونے والی چیز کی قدر زیادہ ہوتی ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے لذت علم کی تکمیل ہوتی ہے۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ اجمال کے بعد وہ شے تفصیل سے سامنے آ جاتی ہے جس سے ہر قسم کا

ابہام ختم ہو جاتا ہے۔ (۱۷۴)

سورہ مومن اٹھائے اور مندرجہ ذیل آیات کا مطالعہ کیجیے:

وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُونِ أَهْدِيكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ يَا قَوْمِ إِنَّمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أَنْثَى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ - وَ يَقَوْمِ مَا لِيُ أَدْعُوكُمْ إِلَى النَّجْوَةِ وَ تَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ تَدْعُونَنِي لِأَكْفَرَ بِاللَّهِ وَ أَشْرِكُ بِهِ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَ أَنَا أَدْعُوكُمْ إِلَى الْعَزِيزِ الْغَفَّارِ - (۳۸-۴۲)

(وہ شخص جو ایمان لایا تھا بولا، اے میری قوم کے لوگو، میری بات مانو، میں تمہیں صحیح

راستہ بتاتا ہوں، اے قوم یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے ہمیشہ کی قیام کی جگہ تو آخرت ہی ہے۔ جو برائی کرے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اس نے برائی کی ہوگی اور جو نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو، ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے جہاں ان کو بے حساب رزق دیا جائے گا۔ اے قوم آخر یہ کیا ماجرا ہے میں تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم لوگ مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں اور اس کے ساتھ ان ہستیوں کو شریک ٹھیراؤں جنہیں میں نہیں جانتا اور میں تم کو خدائے عزیز و غفار کی دعوت دے رہا ہوں)

دیکھئے قوم فرعون کے مرد مومن نے کس حکمت و بلاغت کے ساتھ ان کی دکھتی رگ پکڑی ہے اسے معلوم تھا کہ دنیا طلبی اور حد سے بڑھی ہوئی مادیت زدگی اور آخرت کا انکار ہی وہ چیزیں ہیں جو ایمان کی راہ کے سنگ گراں ہیں چنانچہ اس نے پہلے سبیل الرشاد کی رہنمائی کا اعلان کر کے لوگوں کو تحیر میں ڈال دیا کہ سبیل الرشاد سے کیا مراد ہے۔ پھر دنیا پرستی سے بے نیازی اور یوم آخرت کا خوف پیدا کر کے گویا اس نے صحیح راستے کی وضاحت کر دی جس کی رہنمائی کا اعلان کیا تھا اور بڑی حکمت کے ساتھ انہیں سمجھایا کہ تم لوگ مجھے جہنم کی طرف بلانا چاہتے ہو جب کہ میں تمہاری نجات کی فکر کر رہا ہوں اور تمہیں عزیز و غفار مولیٰ کے دامن میں پناہ لینے کی دعوت دے رہا ہوں۔

سورہ احزاب کی مندرجہ ذیل آیات کا مطالعہ کیجیے:

وَ إِذْ تَقُولَ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللَّهَ وَ تَخْفَى فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ وَ اللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَ طَرَأَ زَوْجُهَا - (۳۷)

(اے نبی یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرو، وہ بات تم اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا تم لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ وہ زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو، پھر جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس کا تم سے نکاح کر دیا)

یہاں وَ تَخْفَى فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ میں ابہام تھا کہ آنحضرتؐ کے دل میں آخر کیا

خیال تھا پھر آگے کی آیات میں اس کی وضاحت فرمادی گئی کہ تم کو حضرت زینب کی دلداری کے لیے انہیں اپنے نکاح میں لینا پڑتا لیکن تمہیں اندیشہ تھا کہ منافقین ایک بڑے فتنے کی راہ کھول دیں گے اور لوگوں میں پروپیگنڈہ کریں گے کہ آپ نے اپنے متنبی کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے تم اس فتنہ سے بچنا چاہتے تھے اس لیے تمہاری آرزو تھی کہ طلاق کی نوبت نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی تھا کہ یہ نوبت آئے اور تمہارے ہاتھوں جاہلیت کی اس غلط رسم کی اصلاح ہو اور تم کسی کی لعنت و ملامت اور مخالفت کی پروانہ کرو بلکہ صرف اللہ سے ڈرو۔ (۱۷۵)

سورہ صافات میں دیکھیے جب اللہ نے یہ فرمایا:

فَاسْتَفْتِهِمُ الرَّبُّ الْبَنَاتُ وَ لَهُمُ الْبَنُونَ (۱۳۹)

(پھر ذرا ان لوگوں سے پوچھو کیا تمہارے رب کے لیے بیٹیاں ہوں اور ان کے لیے بیٹے ہوں) تو مخاطب کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ بیٹیاں کس کو کہا جا رہا ہے؟ وہ کون لوگ ہیں؟ چنانچہ اس کی صراحت آگے کی آیت میں ہو گئی:

أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَ هُمْ شَاهِدُونَ (۱۵۰)

(کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں) (۱۷۶) اس آیت سے اس بات کی وضاحت ہو گئی کہ وہاں بیٹیوں سے مراد فرشتے تھے اس وضاحت نے تمام اشکالات کو رفع کر دیا۔

سورہ مومن کی اس آیت کو دیکھیے:

وَإِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ وَ إِنْ يَكُ صَادِقًا يُصِيبْكُمْ بَعْضَ الَّذِي يَعِدُكُمْ (۲۸)

(اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا وبال اس کے سر آئے گا اور اگر وہ سچا ہے تو وہ چیز جس کا تم کو وعید

سنا رہا ہے اس کا کوئی حصہ تم پر نازل ہو کر رہے گا)

یہاں بعض الذی یعدکم مبہم ہے اس کو آگے یوں کھول کر رکھ دیا:

وَ قَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ

مِثْلَ دَابِّ قَوْمِ نُوحٍ وَ عَادٍ وَ ثَمُودَ وَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ وَ مَا اللَّهُ

يُرِيدُ ظَلْمًا لِلْعِبَادِ (۳۰-۳۱)

(وہ شخص جو ایمان لایا تھا اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر

وہ دن نہ آجائے جو اس سے پہلے بہت سے جتھوں پر آچکا ہے جیسا دن قوم نوح، عاد اور
ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی
ارادہ نہیں رکھتا)

اس آیت سے صراحت ہو گئی کہ وہاں عذاب کی دھمکی دی گئی تھی سورہ زخرف میں اس
اسلوب کی جلوہ گری یوں ہوئی:

أَمْ اتَّخَذَ مِنْ يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَكُمْ بِالْبَنِينَ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُكُمْ بِمَا
ضَرَبَ لِلرَّحْمَنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهَهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ أَوْ مَنْ
يُنشئُوهُ فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ
الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ إِنَاتًا أَشْهَدُوا خَلَقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ
وَهُمْ يُسْأَلُونَ (۱۶-۱۹)

(کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا اور
حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے رحمن کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی
ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے
اور وہ غم سے بھر جاتا ہے کہ کیا وہ اولاد پیدا ہوئی ہے جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بخت و
حجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح نہیں کر سکتی (۱۷-۱۸) انھوں نے فرشتوں کو جو خدائے
رحمان کے خاص بندے ہیں عورتیں قرار دے لیا کیا ان کے جسم کی ساخت انھوں نے
دیکھی ہے؟ ان کی گواہی لکھی جائے گی اور انہیں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی)

ان آیات میں (۱۶-۱۸) ابہام تھا۔ بنت کا لفظ تھیر اور اشتیاق میں بتلا کر رہا تھا جسے آیت
(۱۹) نے دور کر دیا کہ یہاں بنت سے مراد فرشتے ہیں۔

۱۹- تنکیر کے کچھ خاص اصول

تنکیر و تعریف کے عام اصولوں کو نحو کی کتابوں میں دیکھنا چاہیے یہاں کچھ خاص اسالیب پر جنہیں قرآن نے استعمال کیا ہے غور کرنا مطلوب ہے۔

۱- کبھی کبھی نکرہ سے کوئی خاص آدمی یا شئی مراد لی جاتی ہے جو سیاق کلام سے سمجھ میں آتی ہے مثال کے طور پر سورہ انعام کی مندرجہ ذیل آیات کو دیکھیے:

وَ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ كَلًّا هَدَيْنَا (۸۴)

(پھر ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب جیسی اولاد عطا کی اور ہر ایک کو راہ راست دکھائی)

یہاں کلا گرچہ نکرہ ہے لیکن یہاں عام افراد مراد نہیں ہیں بلکہ اسحاق اور یعقوب ہی مراد ہیں۔ آگے فرمایا:

وَ ذَكَرْنَا وَيْحٰى وَعِيسٰى وَ اِلْيَاسَ كُلًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ (۸۵)

(اور ذکر کیا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو راہیاب کیا ہر ایک ان میں سے صالح تھا)

اس آیت میں کُلُّ کا لفظ گرچہ عام ہے لیکن مراد ذکر کیا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس ہیں۔ آگے مزید فرمایا:

وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ الْیَسَعَ وَ یُونُسَ وَ لُوطًا وَ كَلًّا فَضَلْنَا عَلٰی الْعَالَمِينَ (۸۶)

(اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو راہتہ دکھایا اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی)

یہاں کَلًّا سے مراد مذکورہ انبیاء ہی ہیں۔

سورہ مریم میں فرمایا:

وَ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَ كَلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا (۴۹)

(اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب دیئے اور ہر ایک کو نبی بنایا)

یہاں بھی کَلًّا سے مراد یعقوب و اسحاق علیہما السلام ہیں۔

سورہ انبیاء میں فرمایا:

وَ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً وَ كُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ (۷۲)
(اور ہم نے اسے اسحاق کو عطا کیا اور یعقوب اس پر مزید اور ہر ایک کو صالح بنایا)
یہاں بھی کُلًّا سے مراد اسحاق و یعقوب ہیں۔

آگے فرمایا:

وَ دَاوُدَ وَ سُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمْنَ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَسَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ
وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَ كُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَ
عِلْمًا۔ (۷۹)

(اور اسی نعمت سے ہم نے داؤد اور سلیمان کو سرفراز کیا یاد کرو وہ موقع جب وہ دونوں ایک
کھیت کے مقدمے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی
بکریاں پھیل گئی تھیں اور ہم ان کی عدالت خود دیکھ رہے تھے اس وقت ہم نے صحیح فیصلہ
سلیمان کو سمجھادیا حالانکہ حکم اور علم ہم نے دونوں کو عطا کیا تھا)
یہاں بھی کُلًّا سے مراد داؤد اور سلیمان ہیں۔

آگے مزید فرمایا:

وَ إِسْمَاعِيلَ وَ إِدْرِيسَ وَ ذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ (۸۵)
(اور یہی نعمت اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے)
یہاں بھی کُلٌّ سے مراد سابق انبیاء ہیں۔

۲۔ کبھی کبھی نکرہ تعمیم کے لیے بھی آتا ہے مثال کے طور پر سورہ حشر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ لْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (۱۸)
(اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا
سامان کیا ہے)

یہاں نفس سے مراد کُلُّ نَفْسٍ ہے یعنی ہر ایک جان سوچ لے کہ کل کے لیے اس نے

کیا کیا ہے۔

اسی طرح سورہ منافقون میں ہے:

وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجْلُهَا وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۱)
 (جب کسی کی مہلت عمل پوری ہونے کا وقت آجاتا ہے تو اللہ کسی شخص کو مزید مہلت
 ہرگز نہیں دیتا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے)
 یہاں بھی نفساً سے مراد کل نفس ہے یعنی ہر وہ شخص جس کی مدت حیات ختم ہو چکی ہو
 اللہ اسے ذرا بھی مہلت نہیں دے گا۔

سورہ بقرہ میں یہود کا موازنہ مشرکین عرب سے یوں کیا جاتا ہے:
 وَ لَتَجِدَنَّهٗمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيٰوةٍ وَّ مِنَ الَّذِيْنَ أَسْرَكُوْا يٰوَدَّ
 أَحَدَهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ الْفَ سَنَةٍ وَّ مَا هُوَ بِمُزْحِزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ
 يُعَمَّرَ وَاَللّٰهُ بِصٰبِرٍ بِمَا يٰعْمَلُوْنَ (۹۶)

(اور تم ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے ان لوگوں سے بھی زیادہ جنہوں نے
 شرک کیا ہے ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اس کو ہزار سال عمر ملے حالانکہ یہ
 عمر بھی ان کو ملے تو بھی وہ اپنے آپ کو خدا کے عذاب سے بچانے والے نہیں بن سکتے اور
 اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں)

یہاں جس زندگی کا تذکرہ ہے وہ بالکل مطلق ہے وہ زندگی کے حریص ہیں قطع نظر اس سے
 کہ وہ زندگی بلند ہے یا پست انہیں تو بس زندگی کی محبت ہی سب کچھ دکھائی دیتی ہے یہ لوگ فکری و
 اخلاقی حیثیت سے نہایت پست سطح پر ہیں۔ زندگی اگر مثالی اور اعلیٰ اقدار کی حامل ہو تو مرغوب ہے
 لیکن پست زندگی، زیب و زینت اور لہو و لعب کی زندگی قابل نفیر ہے اس لیے یہودیوں پر لعنت و
 ملامت کی گئی ہے۔

۳۔ بسا اوقات نکرہ تعظیم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَ جَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْا اِنَّ لَنَا لَآجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِيْنَ (اعراف: ۱۱۳)

(جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوئے بولے بڑا صلہ ملے گا ہمیں اگر ہم ہی غالب رہے)

یہاں اِنَّ لَنَا لَآجْرًا دراصل لَآجْرًا عَظِيْمًا کے معنی میں ہے یعنی ساحروں نے سامنے

آتے ہی اپنے اس ارمان اور توقع کا اظہار کیا کہ اگر ہم نے بازی جیتی تو سرکار سے بڑا انعام ملے گا۔

اسی طرح قرآن میں جہاں کہیں ذکر کا لفظ نکرہ استعمال ہوا ہے تعظیم و تفضیم کے لیے

استعمال ہوا ہے مثال کے طور پر دیکھیے:

أَوْ عَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَى رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ
وَلِتَتَّقُوا (اعراف: ۶۳)

(اور کیا تمہیں یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی یاد دہانی تمہیں
میں سے ایک شخص کے ذریعہ سے آئی تاکہ وہ تمہیں باخبر کرے اور تاکہ تم ڈرو)

وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (یوسف: ۱۰۴)

(اور تم اس پر ان سے کوئی معاوضہ تو نہیں طلب کر رہے ہو یہ تو بس دنیا والوں کے لیے یاد دہانی ہے)

چنانچہ کہیں ذکر کا امتیاز یہ بیان ہوا ہے کہ وہ وحی الہی ہے کہیں اسے سارے عالم کی یاد دہانی
کہا گیا ہے اور کہیں اسے بابرکت اور مقدس قرار دیا گیا ہے اور قرآن پر نظر رکھنے والے حضرات
جانتے ہیں کہ اس ذکر سے مراد خود یہ قرآن ہے۔

۳۔ کہیں نکرہ تقلیل کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے:

وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ وَ رِضْوَانًا مِّنَ اللَّهِ
أَكْبَرُ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (توبہ: ۷۲)

(مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ایسے باغوں کے لیے ہے جن کے نیچے نہریں

جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ مکانوں کے لیے ابد کے باغوں میں اور

اللہ کی تھوڑی سی خوشنودی بہت بڑی چیز ہے یہی بڑی کامیابی ہے)

یہاں رضوان نکرہ استعمال ہوا ہے جو تقلیل کے مفہوم پر مشتمل ہے یعنی مومن مردوں

اور مومن عورتوں سے ابدی باغات، جاری نہروں اور پاکیزہ مکانوں کا وعدہ ہے ہی لیکن یہ

سارے صلے خدا کی خوشنودی کے مقابلے میں ہیچ ہیں چاہے وہ بظاہر تھوڑی سی حاصل ہو آدمی کی

اصل کامیابی یہ ہے کہ اس کا مالک اس سے خوش ہو جائے۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن کہتا ہے:

مَا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَ مَا نَحْنُ بِمُتَّبِعِينَ

(جاثیہ: ۳۲)

(ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہے۔ بس ایک گمان ہے جو ہم کرتے ہیں اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں)

یہاں مطلب یہ ہے کہ قیامت کے بارے میں بس انہیں ایک معمولی سا گمان ہے یقین ہرگز نہیں ہے۔

یہی نکرہ بسا اوقات تحقیر و تذلیل کا مفہوم بھی دے دیتا ہے جیسے ذیل کی آیات دیکھیے:

أَكْفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا (كہف: ۳۷)

(کیا تم نے اس ذات کا انکار کیا جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے، پھر تم

کو ایک مرد بنا کر کھڑا کیا)

قَتَلَ الْإِنْسَانَ مَا أَكْفَرَهُ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ مِنْ نُطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ (عبس: ۱۷-۱۹)

(براہو آدمی کا، یہ کتنا شکر ہے! اسے کس چیز سے پیدا کیا؟ پانی کی ایک بوند سے اس کو پیدا

کیا پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھیرا)

یہاں نکرہ کا استعمال تحقیر و تذلیل کے لیے ہے فرمایا کہ نجس پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوئی

مخلوق کو اپنی برتری و پاک دامنی کا غرہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو پیدا کنی حق دار جنت سمجھے۔

ان مشرکین کے اس زعم پر قرآن نے ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں ضرب لگائی ہے:

فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قِبَلِكُمْ مَهْطِعِينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشَّمَالِ

عَزِيزِينَ أَيْطَمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يَدْخُلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ كَلَّا إِنَّا

خَلَقْنَاهُمْ مِمَّا يَعْلَمُونَ (معارج: ۳۶-۳۹)

”پس ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ تمہارے اوپر پلے پڑ رہے ہیں، داہنے بائیں سے

ٹولیاں بنا بنا کر، کیا ان میں سے ہر شخص یہ توقع لیے بیٹھا ہے کہ وہ نعمت کے باغ میں داخل

کر دیا جائے گا؟ ہرگز نہیں، ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں۔

۵۔ نکرہ بسا اوقات تشویق و ترغیب کے لیے بھی استعمال ہوا ہے مثال کے طور پر سورہ صف

میں ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنَجِّيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ

الْيَمِّ (۱۰)

(اے ایمان والو کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے نجات بخشنے)

یہاں لفظ تجارت کا نکرہ استعمال ہونا شوق و رغبت دلانے کے لیے ہے۔

لیکن یہ پہلو ہمیشہ نگاہ میں رہنا چاہیے کہ یہ تمام فوائد اور استعمالات موقع و محل کے لحاظ سے حاصل ہوتے ہیں سیاق کلام ہی سے ان فوائد کی طرف ذہن منتقل ہو سکتا ہے اس سلسلے میں کوئی قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جاسکتا۔

خلاصہ

حضرات انبیاء کرام کی زبان نہایت فصیح، شستہ، شیریں اور موثر ہوتی تھی۔ وہ دعوت کے لیے ایسا اسلوب اور ایسی زبان استعمال کرتے تھے جو دلوں میں اتر جاتی تھی اور بدترین مخالف کو بھی چت کر دیتی تھی۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے بڑا معجزہ قرآن دیا گیا تھا جو ادب کا سب سے اعلیٰ شاہکار اور فصاحت و بلاغت کا بے بدل نمونہ تھا، جس نے عرب کے فصحاء و بلغاء کو اس جیسی ایک ہی سورہ لانے کی دعوت دی لیکن وہ اس دعوت اور چیلنج کو قبول نہ کر سکے اور وقت کے ملک الشعراء اور فصیح دوراں بھی اس کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئے۔

لیکن اس کے ساتھ ایک معجزہ آپ کو اور عطا کیا گیا تھا اور وہ جوامع الکلم کا تھا، چھوٹے چھوٹے گٹھے ہوئے جملے، شیریں و موثر لب و لہجہ، حکمت و نصیحت سے بھرپور کلمات، ایک ایک لفظ موتیوں سے ٹنکا ہوا۔

دراصل قرآن پاک کا یہ اعجاز اس کی آیات کے باہمی ربط و نظام میں پوشیدہ ہے کتاب حکیم کی حکیمانہ نظم و ترتیب ہی ان سارے کارناموں کی بنیاد ہے۔ اس بے مثال نظم و ترتیب سے وہ لازوال اسلوب ادب وجود میں آیا ہے جو دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں پایا جاتا۔

لیکن ضروری ہے کہ قرآن کا یہ اسلوب نحو و بلاغت کے قواعد و ضوابط سے نہ پرکھا جائے بلکہ قرآن کے اسلوب اور استعمالات کو سامنے رکھ کر فن نحو و بلاغت کو از سر نو تشکیل دیا جائے۔

اس وقت آپ دیکھیں گے کہ قرآن کا اسلوب تکرار، تخلیص، مخاطب، عود الی البدء، تضمین، حذف، تنکیر و تعریف، تکمیل و تقابل، تجنیس و مشاکلت، قسم و تصریف اور دوسرے تمام اسالیب ادب اور بلاغت کے اس مقام پر ہیں جہاں تک انسانی ذہن نہیں پہنچ سکتا۔ کمال یہ ہے کہ یہ تمام اسالیب جاہلی کلام میں مستعمل ہیں لیکن قرآن کا ادب نرالا اور انوکھا ہے۔ اور اس وقت آپ کو یہ احساس ہو گا کہ قرآن کا یہ چیلنج کتنا وزنی ہے:

”کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لاسکیں گے چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔“ (بنی اسرائیل: ۸۸)

عود الی البدء وہ اسلوب ہے جس میں کلام کا آغاز جس چیز سے ہوا ہو اسی پر اس کا خاتمہ بھی ہوتا ہے تاکہ اس کی معنویت و افادیت دلوں پر نقش ہو جائے۔

مشاکلت میں بعض الفاظ محض مجانست اور صوتی ہم آہنگی کی وجہ سے استعمال ہو جاتے ہیں اور ان کا مفہوم لغت کے اعتبار سے نہیں بلکہ سیاق کلام اور موقع و محل سے متعین ہوتا ہے۔
نہی کے ساتھ قید کا فائدہ محض صورت حال کے گھنونے پن کا اظہار ہوتا ہے۔ قید اس لیے بڑھادی جاتی ہے تاکہ وہ صورت واقعہ سامنے آجائے جو اس کے ارتکاب میں مضمر ہے۔

اسلوب تصرف میں الٹ پلٹ کر اور ہیر پھیر کر آیات بیان کی جاتی ہیں اور ہر جگہ اس کے اطراف و جوانب اور لواحق و تضمینات بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔

تخلیص کو اردو شاعری کی اصطلاح میں گریز کہا جاسکتا ہے جسے امام ابن قیم جوزی نے انتقال من فن الی فن کا اور سیوطی نے حسن التخلص کا نام دیا ہے یعنی بات میں سے بات پیدا ہو جاتی ہے اور چلتے چلتے مناسب حال گفتگو بھی ہو جاتی ہے۔

تکرار محض سے قرآن پاک خالی ہے جہاں کہیں الفاظ، جملوں یا معانی کی تکرار نظر آتی ہے وہاں کوئی نئی بات کوئی لطیف حکمت اور جدید نکتہ سمجھانا ہوتا ہے بالکل یہی بات قصص و واقعات کے تکرار میں بھی ہے۔

قرآن پاک میں استشہاد و استدلال کے لیے قسمیں کھائی گئی ہیں۔ قرآن نے توحید و رسالت اور آخرت پر گفتگو کرنے کے لیے اور ان مابعد الطبعی حقائق کو ذہن نشین کرانے کے لیے جن وسائل و اسالیب کا سہارا لیا ہے ان میں ایک موثر اسلوب قسم ہے جہاں زور اور تاکید کے ساتھ بطور دلیل اپنی بات رکھ دی جاتی ہے اور منکر حق کے لیے غور و فکر کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔
قرآن کبھی براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتا ہے اور کبھی نبی کے واسطے سے قوم کو، کبھی واحد کے صیغے میں اس کا مخاطب ہوتا ہے اور کبھی جمع کے صیغے میں پھر جہت خطاب کی تبدیلی اور اس کے عموم و خصوص سے بڑی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اس لیے ان تمام امور کا ادراک

ضروری ہے۔

کبھی عطف کے ساتھ یا بغیر عطف کے دو الفاظ یا متصل جملوں میں ربط پیدا ہو جاتا ہے جس سے گونا گوں مفاہیم و معانی پیدا ہو جاتے ہیں اس اسلوب کو قرآن کہا جاتا ہے۔

عرب الحرّ یکفیه الإشارۃ کے عادی تھے اور ان کے نزدیک بہترین کلام وہ تھا جو ما قبل و مادّٰی ہو اسی لیے کلام کے ان غیر ضروری اجزاء کو نکال دیتے تھے جس کے بغیر بھی بات سمجھ میں آجائے اسی کو خذف کہتے ہیں۔

کسی نامعلوم چیز کے بارے میں سوال کرنے کو استفہام کہا جاتا ہے لیکن مثبت و منفی دونوں طریقوں میں قرآن نے متعدد فوائد اور حکمتوں کو سامنے رکھ کر اس اسلوب کو استعمال کیا ہے۔ یہی حال نفی کا بھی ہے اس کے استعمال کی متعدد شکلیں قرآن نے اختیار کی ہیں جو جاہلی کلام میں رائج تھیں۔

حال کی دو مختلف و منفرد شکلوں کا اظہار کیا گیا ہے جو بلاغت کی کتابوں میں موجود نہیں لیکن کلام جاہلی اور قرآن میں اس کی متعدد نظیریں ملتی ہیں۔

وصف کی بھی قرآن نے متعدد صورتیں استعمال کی ہیں اور ان کے ہمہ گیر فوائد حاصل کیے ہیں بسا اوقات قرآن کوئی لفظ یا جملہ یا چند جملے ایسے بھی استعمال کر جاتا ہے جن کے بغیر بھی گفتگو مکمل ہو سکتی تھی لیکن انہیں کسی مناسب حال اور مقتضائے موقع فائدہ کے پیش نظر درمیان کلام لے آیا گیا یہی اسلوب اعتراض کہلاتا ہے۔

ایک اور اسلوب تکمیل کا ہے یعنی بات محتاط اور معتدل انداز میں کہی جائے لیکن اس سے گفتگو مکمل ہوتی نظر نہ آرہی ہو یا کسی التباس کا اندیشہ ہو یا اتنی گفتگو سے مخاطب کسی غلط فہمی میں اور شک و شبہ میں مبتلا ہو سکتا ہو تو اس کی وضاحت کر کے بات مکمل کر دی جائے اس اسلوب کو ارباب بلاغت نے احتراس کا نام دیا ہے قرآن کے بے مثل ادب نے اسے بھی شرف قبولیت بخشی ہے۔

عطف بالواو کا عام فائدہ جمع و ترتیب ہے لیکن اس عام فائدے سے ہٹ کر قرآن نے اس سے تبیین و توضیح، نتائج پر گفتگو کمال اتصال، علت و سبب کے اظہار وغیرہ کے فوائد بھی حاصل کیے ہیں جو جاہلی کلام میں عام تھے۔

قرآن نے کہیں کہیں ابہام کے بعد تفصیل و توضیح کا اسلوب بھی استعمال کیا ہے اس سے

متعدد فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ معنی و مفہوم واضح ہو جاتا ہے، لذت علم کی تکمیل ہو جاتی ہے، اشتیاق کے بعد حاصل ہونے والے علم سے ذہن آسودہ ہو جاتا ہے اجمال کے بعد وہی شے تفصیل سے سامنے آ جاتی ہے اور ہر قسم کا ابہام و التباس ختم ہو جاتا ہے۔

تئیکیر کے اسلوب میں بھی عام استعمال سے قطع نظر قرآن نے متعدد حکمتوں اور فائدوں کو اس کے استعمال میں ملحوظ رکھا ہے۔

یہاں قرآن کے ادبی اسالیب میں سے صرف انیس اسلوبوں پر گفتگو کی گئی ہے گویا بحر ذخار سے چند قطرے اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں پورا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آسکتا ہے لیکن یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ ع ہر قطرہ دریا میں ہے دریا کی گہرائی۔

قرآن مبین کا ادب معجزہ، اس کی بلاغت مافوق الفطری، اس کا اسلوب الہامی اس کی فصاحت منزل من اللہ ہے اس لیے اس کی حکمتوں اور اسرار کو انسانی کوزے میں کیوں کر سمیٹا جاسکتا ہے۔ بس یہ تھوڑے سے رشحات ہیں جو اس الہامی بارش کی حکمتوں اور فوائد و ثمرات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ قرآن کا حال یہ ہے کہ جس قدر اس کی ادبی نزاکتوں پر گفتگو کی جائے وہ انسانی ہاتھوں کی رسائی سے مزید بلند ہو جاتی ہیں، جتنی زیادہ اس کی فصاحت و بلاغت پر روشنی ڈالی جائے ہماری بے بسی اور عاجزی و در ماندگی کا احساس دو چند ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک ماضی میں معجزہ تھا حال میں معجزہ ہے اور مستقبل میں قیامت تک کے لیے معجزہ رہے گا اور یہ اعجاز اس کے ادب، اس کی بلاغت اس کے نظم و ترتیب، اس کے معانی و مطالب اس کی نغمگی و صوتی ہم آہنگی، اس کے جمال و جلال، اس کی پیشین گوئیوں اور غیبی انکشافات اور اس کی سائنسی ایجادات و اختراعات کی طرف اشاروں غرضیکہ ہر جہت سے ہر پہلو سے اور ہر میدان میں نمایاں ہے۔

تعلیقات و حواشی

- (۱) حمید الدین فراہی، القائد إلى عیون العقائد، اعظم گڑھ، ۱۳۹۵ھ، ص: ۱۷۷-۱۸۰
- (۲) قرآن، یس: ۶۹ ”ہم نے اس کو شعر نہیں سکھایا ہے نہ یہ اس کے کرنے کا کام ہے نیز شعراء ۲۲۳-۲۲۵ اور طور: ۲۹-۳۲
- (۳) قرآن، مدثر: ۲۴ ”آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔
- (۴) سید محمد یوسف: قرآن کا ادبی اسلوب: سیارہ ڈائجسٹ لاہور قرآن نمبر جلد دوم
- (۵) سید قطب شہید، التصوير الفنی فی القرآن، الطبعة الثالثة، مصر، ص: ۲۳
- (۶) عبدالکریم الخطیب، اعجاز القرآن۔ دار الفکر العربی ۱۳۷۳ھ، ص: ۱۲۱
- (۷) مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی، بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز الجزء الاول، ص: ۶۸
- (۸) نعیم احمسی، تاریخ فکرۃ اعجاز القرآن، الجمع العلمی العربی دمشق ۱۹۵۵ء، ص: ۵۳-۵۶
- (۹) محمد عبدالعظیم الزرقانی، مناهل العرفان فی علوم القرآن الجزء الثانی ۱۹۵۳ء، ص: ۲۰۵-۲۲۰ نیز دیکھیے محمد علی الصابونی، التبیان فی علوم القرآن ۱۹۷۰ء، ص: ۱۰۷-۱۰۸
- (۱۰) یہ بات حضورؐ نے اس وقت کہی تھی جب وفد ثقیف نے آپ سے نمازوں کی معافی کی درخواست کی تھی۔ محمد غزالی، فقہ السیرۃ ۱۴۰۰ھ، ص: ۶۲۶ بحوالہ ابوداؤد ۲/۲۲۲، ابن ہشام ۲/۳۲۵-۳۲۶
- (۱۱) قرآن، حجرات: ۱۱ ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں“
- (۱۲) لسان العرب، ۵/۱۸۳
- (۱۳) ابوہلال عسکری، الفروق، بحوالہ سید محمد مرتضیٰ زبیدی، تاج العروس، ۳/۵۲۸
- (۱۴) سنن ابوداؤد باب المکر فی الحرب، ص: ۳۵۳، بخاری کتاب الجہاد: ۱۰۳، المغازی: ۷۹، مسلم توبہ: ۵۳، داری، سیر: ۱۴، مسند احمد بن حنبل: ۳/۳۵۶-۳۵۷
- (۱۵) شوکانی، فتح القدر: ۱/۳۴۴، قرآن میں یہ لفظ اور دوسری جگہوں پر بھی اللہ کے لیے استعمال ہوا ہے جیسے انفال: ۳۰، اعراف: ۹۹، یونس: ۲۱، رعد: ۴۲، ابراہیم: ۴۶، نحل: ۵۰ وغیرہ
- (۱۶) اسی مفہوم کو سورہ مائدہ کی آیت ۴۴ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: ”ہم نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے اسی کے مطابق یہود کے معاملات کے فیصلہ کرتے رہے وہ انبیاء جنہوں نے خدا کی فرمانبرداری کی اور مرتبوں اور علماء نے بھی اسی کے مطابق فیصلے کیے کیوں کہ وہ کتاب الہی کے امین بنائے گئے تھے اور اس کے گواہ ٹھہرائے گئے تھے تو تم لوگوں سے نہ ڈرو صرف مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو حقیر قیمت کے عوض نہ بیچو“

(۱۷) قرآن پاک کے اسی اسلوب کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض حضرات نے یہ ترجمہ کر دیا ہے کہ دو گنا تکنا سود نہ لو یعنی جو سود دو گنا تکنا نہ ہو اسے لینا ان کے نزدیک جائز ہے ان کے نزدیک فی نفسہ ربوا کی ممانعت نہیں ہے بلکہ دو چند سے چند ربوا لینے کی ممانعت ہے۔ پھر انہوں نے کمرشیل انٹرسٹ کو اسی استدلال کی بنیاد پر حلال اور جائز قرار دے دیا حالانکہ یہ استدلال بالکل غلط اور اسلوب قرآن سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں اس طرز فکر کی ابتداء سر سید احمد مرحوم سے ہوئی (تفسیر قرآن سورہ بقرہ آیت ربوا) اور ان کی پیروی ان کے مکتب خیالی کے لوگوں نے کی مثلاً نذیر احمد (الحقوق والفرایض، ۲: ۲۱۸ تا ۲۲۲) سید طفیل احمد منگلوری (مسئلہ سود اور مسلمانوں کا مستقبل) اور اقبال سہیل (حقیقۃ الربا) وغیرہ بعض مصری علماء مثلاً شیخ محمد عبدہ (رشید رضا: المنار ۳: ۱۱۶) توفیق آفندی، شیخ اسماعیل خلیل اور ترکی کے بعض تجدید پسند حضرات نے اس طرح کے خیالات ظاہر کیے۔ اس مسئلہ کی دینی و شرعی حیثیت دیکھنے کے لیے پڑھیے: فضل الرحمن، تجارتی سود تاریخی و فقہی نقطہ نظر سے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۷ء

(۱۸) نور: ۳۲ ”تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور مہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صلح ہوں انکے نکاح کر دو۔“

(۱۹) روایات میں آتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں باقاعدہ چکلے قائم تھے جہاں فجبہ گری کا کام بڑے زور و شور سے

ہوتا تھا۔ وہ لوگ اپنی لونڈیوں سے پیشہ کراتے تھے اور ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتے تھے ان میں سے بعض

دور اسلام میں بھی خفیہ طور سے یہ کاروبار چلا رہے تھے چنانچہ تاریخوں میں یہ ذکر موجود ہے کہ مشہور

منافق عبداللہ بن ابی نے ایک چکلہ قائم کر رکھا تھا۔ تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۲۸۹-۲۸۸

(۲۰) بنی اسرائیل: ۳۱ ”اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔“

(۲۱) حمید الدین فراہی، مقدمہ تفسیر نظام القرآن، ص: ۴۸-۴۹

(۲۲) سورہ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیت اس باب میں نہایت جامع ہے فرمایا: بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت،

رات اور دن کی گردش اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کے نفع کی چیزیں لے کر چلتی ہیں اور اس

پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا پس اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کر دیا اور اس میں

ہر قسم کے جاندار پھیلانے اور ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر ہیں

ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لینے والے ہیں (بقرہ: ۱۶۴)

(۲۳) نیز دیکھیے سورہ ذاریات: ۶-۱۰ ہواؤں کے تصرفات کی شہادت گونا گوں پہلوؤں سے دیکھنا ہو تو ملاحظہ

کیجیے: (۱) حمید الدین فراہی، تفسیر سورہ ذاریات، (۲) امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن جلد ششم ص:

۵۸۶-۵۸۹ نیز جلد ہشتم، ص: ۱۳۱-۱۳۲

(۲۴) روم: ۳۰ فطرت اللہ التي فطر الناس علیہا لا تبدل لخلق اللہ ذلک الدین القیم ولكن اکثر

الناس لا یعلمون یعنی ”فاتم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی

ساخت بدلی نہیں جاسکتی یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔“

(۲۵) نمل: ۳۶، انبیاء: ۲۵، پینتہ: ۵، یوسف: ۳۹-۴۰، مائدہ: ۷۲، انعام: ۷۲-۸۱، ابراہیم: ۳۵-۳۶

(۲۶) انعام: ۴۰-۴۱، یونس: ۲۲-۲۳، روم: ۳۲-۳۳، زمر: ۸

(۲۷) بقرہ: ۲۱-۲۲، روم: ۲۰-۲۱، یونس: ۳۶-۴۲، حدید: ۲-۶، انعام: ۹۵-۹۸، مومنون: ۹۰

(۲۸) نمل: ۶۰-۶۲، فرقان: ۱-۳، نحل: ۶۵-۷۳ (۲۹) سیوطی، الاتقان، ص: ۱۰۹

(۳۰) سید ابوالاعلیٰ مودودی، مقدمہ تفہیم القرآن۔ یہی بات کسی قدر فرق کے ساتھ مصطفیٰ صادق رافعی نے بھی کہی ہے دیکھیے تفصیل کے لیے: اعجاز القرآن والبلاغة النبویة ۱۹۶۹ء، ص: ۲۱۹-۲۲۰

(۳۱) دی نیو انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کا مصنف لکھتا ہے ".... اس طرح قرآن اکثر یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ کسی قدر

الل ٹپ انداز میں مرتب کیا گیا ہے By a rather haphazard method of composition اور

اس احساس کو اس حقیقت سے مزید تقویت ملتی ہے کہ مختلف محبوب اور دل نشین جملے جیسے ولكن الله

غفور رحيم، ان الله عليهم حكيم، ولكن اكثر الناس لا يعلمون وغيرہ سیاق و سباق سے بہت کم

تعلق رکھتے ہیں یا بالکل ہی متعلق نہیں ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں محض صوتی نغمگی کے لیے

مربوط کر دیا گیا ہے" (جلد: ۱۵، ۷۷، ۱۹۷۷ء)

اسلام سے متعلق اس طرح کی غلطیوں سے یہ انسائیکلو پیڈیا پر ہے خاص طور سے قرآن پر اس کا جو آرٹیکل

ہے وہ جا بجا نہ صرف اس کے تعصب بلکہ اس کی جہالت کا بھی مظہر ہے۔

(۳۲) اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن محض ایک سطحی کتاب ہے جس کے اندر کوئی دقائق و غوامض

نہیں۔ اس علیم و خبیر کے کلام کی نسبت ایسا گمان کیوں کر کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ فرض کر لیا جائے کہ جب

اللہ بندوں سے کلام کرتا ہے تو معاذ اللہ اپنے غیر متناہی علوم سے کوراہو جاتا ہے اس کے کلام میں وہ گہرے

حقائق اور باریکیاں ہوں گی جن کا کسی دوسرے کلام میں تلاش کرنا بے کار ہے اسی لیے حدیث میں آیا ہے

کہ لا تنقضی عجائبہ (قرآن کے اسرار و عجائب کبھی ختم ہونے والے نہیں) علمائے امت اور حکمائے

امت نے اس کتاب کے دقائق و اسرار کا پتہ لگانے اور ہزار ہا احکام مستنبط کرنے میں عمریں صرف کر دیں

تب بھی اس کی آخر حد تک نہیں پہنچ سکے (علامہ شبیر احمد عثمانی حاشیہ سورہ قمرہ ۱۵، ص: ۶۸۶)

اسی طرح تیسیر للذکر سے تیسیر للاستنباط بھی لازم نہیں آتا اس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ ترغیب

و ترہیب کے متعلق قرآن میں جو مضامین ہیں وہ نہایت جلی ہیں اور وجوہ استنباط کا دقیق ہونا تو خود ظاہر ہے۔

(مولانا اشرف علی تھانوی، مکمل بیان القرآن جلد ۱۱، ص: ۸۴ آیت مذکور کا فائدہ)

تیسیر قرآن کے وہ نمایاں پہلو جو خود قرآن میں مذکور ہیں حسب ذیل ہیں:

(۱) یہ کتاب عربی مبین میں نازل ہوئی ہے یعنی قریش کی فصیح و بلیغ نکسالی زبان میں اس کا نزول ہوا ہے۔

(۲) یہ کتاب بالترتیب نبما نبما نازل ہوئی ہے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بالترتیب اس کو سنائیں اور

سکھائیں اور اس کی تعلیمات اچھی طرح ہضم کریں۔ اگر پورا قرآن بہ یک دفع نازل کر دیا جاتا تو یہ چیز

تیسیر قرآن کے منافی ہوتی۔ فرمایا:

وَ قُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْثٍ وَ نَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا۔ (بنی اسرائیل: ۱۰۶)

(اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھہر ٹھہر کر اسے لوگوں کو سناؤ

اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اتارا ہے)

(۳) قرآن کی تمام بنیادی تعلیمات پہلے گٹھے ہوئے الفاظ اور فقروں اور چھوٹی چھوٹی جامع اور محکم

سورتوں کی شکل میں نازل ہوئیں پھر جب لوگ مانوس ہو گئے تو اللہ نے ان محکم فقروں کی وضاحت فرمائی

چنانچہ فرمایا:

كِتَابٌ اُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ (هود: ۱)
(فرمان ہے، جس کی آیتیں پختہ ارشاد ہوئی ہیں پھر ان میں تفصیل کر دی گئی ہے ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے)

(۴) قرآن نے تشریف آیات سے خاصا کام لیا ہے۔ ایک ہی بات گونا گوں پہلوؤں سے مختلف شکلوں، مختلف سوابق و لواحق اور نئے اطراف و جوانب کے ساتھ بیان ہوئی ہے تاکہ قاری کے دل میں وہ بات اچھی طرح بیٹھ جائے۔ فرمایا:

كَذَلِكَ نَصْرَفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُشْكِرُونَ (اعراف: ۵۸)

(اسی طرح ہم اپنی آیتوں کو ہیر پھیر کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو شکر گزار ہونے والے ہیں)

(۵) قرآن مکی اور مدنی سورتوں پر مشتمل سات گروپوں میں منقسم ہے یہ ساتوں گروپ مل کر قرآن عظیم کی شکل اختیار کرتے ہیں ہر گروپ کے مطالب مشترک بھی ہیں اور فی الجملہ ایک دوسرے سے ممتاز بھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن مکتبہ چراغ راہ کراچی، ۱۹۵۱ء، ص: ۹۶-۱۷۱ نیز حمید الدین فراہی، دیباچہ تفسیر سورہ اخلاص)

(۳۳) زنجیری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، ۱۹۵۳ء، جلد ۴، ص: ۳۴۹

(۳۴) تفسیر ابن کثیر ۲/۴۶۰ سید قطب شہید، فی ظلال القرآن ۲۹/۲۳۴

(۳۵) تفصیل کے لیے دیکھیے: حمودہ عبدالوہاب، القرآن و علم النفس، ۱۹۶۲ء، ص: ۹۵-۱۰۸

(۳۶) تفصیل کے لیے دیکھیے علی محمد حسن العماری، القرآن والطبائع النفسیة، ۱۹۶۶ء، ص: ۱۳۱-۱۳۸، اسی طرح فاضل مصنف نے سورہ اعراف اور سورہ نساء کی دو متشابہ المعنی آیات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے جس میں بنی اسرائیل کے تین رفح جبل کا تذکرہ ہے اور دکھایا ہے کہ کس طرح ذرا ذرا اسی لغوی ترمیم اور تھوڑے سے اسلوب کے تغیر کے ساتھ مفہوم کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

(۳۷) ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ، کتاب الحيوان حصہ اول تحقیق محمد عبدالسلام ہارون، ص: ۹۴

(۳۸) ابوالہلال الحسین بن عبداللہ بن سہل العسکری، کتاب الصناعتین، ۱۹۵۲ء، ص: ۱۹۳

(۳۹) دیوان عبید بن الابرص، بیروت ۱۹۵۸ء، ص: ۱۴۱-۱۴۲، ابن الشجرى مختارات تحقیق محمد حسن زنائی ۱۹۳۵ء

ص: ۳۹، عسکری کتاب الصناعتین، ص: ۱۴۴، ابن قتیبہ، تاویل مشکل القرآن ۳۷۳-۱۳۳، ص: ۱۸۳،

شرح دیوان امرؤ القیس، ۱۳۲۲ھ ہندوستانی ایڈیشن، ص: ۴

(۴۰) ابوالعباس المفصل، المفصلیات شرح حسن السندوبی ۱۳۴۵ھ، ص: ۱۹۹، الصاجی، ص: ۱۹۴، سیبویہ

الکتاب: ۱/۳۳۱، ابن قتیبہ، تاویل مشکل القرآن ص: ۱۸۳، الباقلائی اعجاز القرآن تحقیق السید احمد الصقر

دار المعارف مصر، ص: ۱۶۰

(۴۱) ابو علی القالی، کتاب الامالی: ۲/۱۲۹، مہذب الاغانی ۱/۱۹۰، نواد افراہم البستانی، المہلہل ۱۹۳۹م، ص: ۶-۷

(۴۲) لاریس شیخوالیسوعی، شعراء النصرانیة ۱۸۹۰م، ص: ۲۷۲-۲۷۳

(۴۳) اس قصیدہ کی خبر جب مہلہل کو پہنچی جس نے شاعر کے بیٹے بھیر کو قتل کیا تھا تو اس نے بھی ترکی بہ ترکی

جوابی قصیدہ کہا اور اس نے اپنے اشعار میں قریبا مربط المشہر منی کو چودہ بار بطور ترجیح استعمال کیا۔
مشتے نمونہ از خروارے چند اشعار درج ہیں:

- | | |
|--------------------------|----------------------------|
| ۱- قریبا مربط المشہر منی | لکلب الذی أشاب قذائی |
| ۲- قریبا مربط المشہر منی | واسئا لانی ولا تطیلا سوالی |
| ۳- قریبا مربط المشہر منی | سوف تبدو لنا ذرات الحجال |
| ۴- قریبا مربط المشہر منی | انّ قولی مطابق لفعالی |
| ۵- قریبا مربط المشہر منی | لکلب فداہ عمی و خالی |
- (شعراء النصرانیة، ص: ۲۷۴-۲۷۵)

ترجمہ:

- ۱- مشہر (گھوڑے کا نام) کو مجھ سے قریب لاؤ کلب (شاعر کا بھائی جو جنگ بوس میں مارا گیا تھا) کی خاطر جس نے میرے سر پر بڑھا پٹاری کر دیا۔
 - ۲- مشہر کو مجھ سے قریب لاؤ اور مجھ سے پوچھو لیکن زیادہ سوالات مت کرنا۔
 - ۳- مشہر کو قریب لاؤ عنقریب پردہ نشینان میرے سامنے آجائیں گی۔
 - ۴- مشہر کو مجھ سے قریب لاؤ میرا قول میرے فعل سے ہم آہنگ ہے۔
 - ۵- مشہر کو مجھ سے قریب لاؤ کلب کی خاطر جس پر میرے چچا اور ماموں فدا ہوں۔
- (۴۴) ابوزید محمد بن ابوالخطاب القرشی، جملہ اشعار العرب، ۱۹۶۳ء، ص: ۱۴۳
- (۴۵) علی حازم و مصطفیٰ امین، البلاغة الواضحة، ۱۹۵۶ء، ص: ۲۵۳
- (۴۶) حمید الدین فراہی، مجموعہ تفاسیر لاہور، ص: ۶۷۳
- (۴۷) انبیاء: ۵۲-۵۴، ”جب انھوں (ابراہیم) نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ مور تیں کیا ہیں جن کی پرستش پر تم جے بیٹھے ہو۔ وہ بولے، ہم نے اپنے بڑوں کو ان ہی کی پرستش کرتے پایا ہے (ابراہیم نے) کہا کہ بے شک تم اور تمہارے بڑے سب صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔“
- (۴۸) البلاغة الواضحة، ص: ۲۴۹ (۴۹) محولہ بالا، ص: ۲۵۳
- (۵۰) علماء نے قرآن کے قصص و واقعات کے سلسلے میں اور بھی مختلف باتیں کہی ہیں۔
- (۵۱) جیسا کہ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے قصص القرآن اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن کے مقدمے میں لکھا ہے۔

- (۵۲) مناع القطان، مباحث فی علوم القرآن، الدار السعودیة للنشر، ص: ۱۵۳
- (۵۳) عبد الوہاب حمودہ، القرآن و علم النفس، ص: ۱۰۳، نیز تفصیل کے لیے دیکھیے: سید قطب، قرآن کے فنی محاسن ۱۹۸۳ء باب قرآن اور واقعہ نگاری، ص: ۲۰۱-۲۱۹
- (۵۴) مقالات سلیمان جلد سوم ۱۹۷۱ء، ص: ۶۸، سید قطب شہید قرآن کے واقعات کی تکرار پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”.... مگر یہ بات قابل غور ہے کہ پورے واقعہ کو نہیں بلکہ اس کی بعض کڑیوں کو مکرر سے کر لایا جاتا ہے۔ خصوصاً ان کڑیوں کو جن میں عبرت و موعظت پر مشتمل مواد مذکور ہوتا ہے۔ جہاں

تک پورے واقعہ کو دہرانے کا تعلق ہے تو ایسا قرآن میں شاذ و نادر ہی ہوا ہے اور وہ بھی خاص وجوہ و اسباب اور سیاق و سباق کی مناسبت کی بنا پر۔ چنانچہ واقعات کے اغراض بیان کرتے ہوئے ہم اس پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ جب قاری واقعہ کی لائی گئی کڑیوں کا مکرر مطالعہ کرتا اور ساتھ ہی اس کے سیاق و سباق پر نگاہ ڈالتا ہے تو ان کو مکمل طور پر اس واقعہ سے ہم آہنگ پاتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ جس کڑی کو جہاں کہیں بھی لایا گیا ہے اور اس کے لیے جو اسلوب بیان بھی اختیار کیا گیا ہے وہ بالکل درست ہے اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ بنیادی طور سے قرآن کریم کتاب دعوت ہے اس لیے واقعہ کی جو کڑی ذکر کی گئی ان دونوں میں کامل یک رنگی و ہم آہنگی کا ہونا قرآن کا اولین مقصد ہے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے مگر واقعہ کا فنی پہلو اس سے متاثر نہیں ہو پاتا“ (قرآن کے فنی محاسن ص: ۲۲۰)

(۵۵) یہ نکتہ مولانا ابواللیث ندوی نے اپنے ایک مضمون ”قرآن میں تکرار کی نوعیت اور قصہ آدم و شیطان“ مطبوعہ الاصلاح سرائے میرا عظیم گڑھ، مارچ۔ مئی ۱۹۳۶ء میں اٹھایا ہے۔

(۵۶) احادیث میں بھی اس امر کی صراحت موجود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نوید مسیحا اور دعائے خلیل کا مظہر تھی۔

(۵۷) تفہیم القرآن جلد دوم ۱۹۵۸ء، ص: ۲۲۲۔

(۵۸) دیوان اوس بن حجر، تحقیق و شرح ڈاکٹر محمد یوسف نجم، ص: ۳۶، کتاب الاضنام، ص: ۱۷۔

(۵۹) دیوان عبید بن الابرص، ص: ۲۹، دار البیروت، ۱۳۷۷ھ، الشعراء الصعاليك، ص: ۲۹۸۔

(۶۰) دیوان النابغة، ص: ۷۶، الشعراء والشعراء، ص: ۶۲، ابواسحاق نجیری ایمان العرب فی الجاہلیۃ تحقیق محبت الدین الخطیب، ص: ۱۳۔

(۶۱) سیرۃ النبی، ج: ۱، ص: ۳۹ (۶۲) ابن یعیش شرح المفصل ۹۰/۹

(۶۳) المختص ۱۱۰/۱۳ (۶۴) الکتاب ۵۳۱/۱

(۶۵) ابن قیم التبیان فی أقسام القرآن، ص: ۲، علماء کا کہنا ہے کہ بے فائدہ چیزوں کے ذکر سے بچنے کے لیے

تاکید کا استعمال ہوتا ہے چنانچہ مخاطب اگر سادہ ذہن کا مالک ہو تو اسے تاکید و قسم کی ضرورت نہیں

رہتی۔ اگر وہ شک و تردید میں مبتلا ہو تو تاکید سے اسے فائدہ پہنچتا ہے اور تاکید کی کلام بہتر ہوتا ہے اور اگر وہ

منکر ہو تو اس کے انکار کے حساب سے تاکید و قسم کا اسی قدر استعمال واجب ہو جاتا ہے (دیکھیے البرہان

فی علوم القرآن للزرکشی: ۳۹۰/۲)

(۶۶) ابن قیم حوالہ بالا، ص: ۱۰۰ (۶۷) ابن قیم حوالہ بالا، ص: ۱۰۶

(۶۸) حوالہ بالا، ص: ۸۸ (۶۹) حوالہ بالا، ص: ۱۱۰

(۷۰) امام رازی، مفتاح الغیب جلد ۷، ص: ۱۲۱ (۷۱) حوالہ بالا جلد ۷، ص: ۶۲۶-۶۲۷

(۷۲) زرکشی، البرہان ۳/۴۰، السیوطی، الاتقان ۳/۳۶

(۷۳) دیکھیے زرکشی ۳/۴۱، اور سیوطی ۳/۳۶ میں قشیری کا کلام

(۷۴) حمید الدین فراہی، اقسام القرآن، ص: ۶۸ (۷۵) دیکھیے کتاب الاغانی ۲۳/۳۳۸

(۷۶) دیوان النابغة جمع و شرح محمد الطاہر عاشور، ص: ۲۳۱

(۷۷) حمید الدین فراہی، اقسام القرآن طبع دوم، ص: ۶۹-۷۰

(۷۸) تفسیر ابن جریر ۱۳/۴۲، تفسیر ابن کثیر ۲/۵۵۵

(۷۹) علامہ ابن قیم لکھتے ہیں کہ اسلاف و اخلاف میں سے اکثر مفسرین اس بات کے قائل ہیں بلکہ اس میں کوئی

اختلاف ہی نہیں ہے کہ لَعْمَرَكْ میں حیات رسول کی قسم کھائی گئی ہے اور مقصد رسول پاک کی تعظیم و

تکریم اور تفضیل ہے۔ لیکن زحشری یہاں تک نہ پہنچ سکے اور یہ نکتہ ان کی سمجھ میں نہ آسکا چنانچہ انہوں

نے یہ سمجھا کہ یہاں حیات لوط کی قسم کھائی گئی ہے اور فرشتوں کا قول ہے یعنی فرشتوں نے لوط سے کہا کہ

تیری جان کی قسم! حالاں کہ سیاق کلام اس کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ ظاہر الفاظ اور سیاق کلام دونوں یہ بتاتے ہیں

کہ یہاں مراد رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ اعتزالی نقطہ نظر غلط ہے (التبیان، ص: ۲۷۲-۲۷۳)

(۸۰) الکشاف، ۳/۷۷، القرطبی ۱۶/۶۱، الفتوحات الالہیہ ۳/۷۶، فتح القدر ۲/۵۳۷

(۸۱) تفسیر ابن جریر ۳۰/۲۳۱، الکشاف ۳/۲۶۳ (۸۲) الاشارة الی الایجاز فی بعض انواع المجاز، ص: ۲۲

(۸۳) حمید الدین فراہی، رسالہ الامعان فی اقسام القرآن

(۸۴) ابن کثیر نے مجاہد، سدسی اور ابن جریج وغیرہ کی طرف اس قول کو منسوب کیا ہے اور مَا عَلَى الَّذِينَ

يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ کا مطلب یہ لیا ہے کہ اگر یہ لوگ کفار و مشرکین کے ساتھ بیٹھ جائیں تو

کوئی حرج نہیں ہے لیکن نساء کی مندرجہ بالا آیت نے ان کے اس مفہوم پر یہ کہہ کر خط نسخ پھیر دیا کہ

إِنكُمْ إِذَا مَثَلْتُمْ (اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہیں کی طرح ہو) تفسیر ابن کثیر حصہ دوم ص: ۱۲۴۔

تفسیر ابن جریر بتحقیق محمود محمد شاکر: ۱۱/۴۴۰

(۸۵) امین احسن اصلاحی، تدر قرآن: ۲/۴۵۴-۴۵۵

(۸۶) مثال کے طور پر دیکھیے سورہ الزخرف آیت ۳۶، ۳۷، اور سورہ یوسف آیت: ۱۰۔

(۸۷) یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا ہے لیکن یہ حکم

در اصل تمام قاضیوں اور فیصلہ کرنے والوں کے لیے عام ہے اس لیے خطاب بعد میں جمع کے صیغے سے کیا

گیا گویا نبی اپنی ذات سے پوری امت اور قوم کا نمائندہ ہے نبی کو مخاطب کرنے سے بات زیادہ پر زور اور موثر

ہو جاتی ہے سورہ نصر میں آپ کو جس استغفار کا حکم دیا گیا ہے اس کی بھی یہی نوعیت ہے۔

یہاں اس اسلوب میں ایک قابل غور پہلو اور ہے وہ یہ کہ اس میں ان لوگوں سے ایک قسم کی بے التفاتی و

بے پروائی کا اظہار ہو جاتا ہے جن کی سرزنش مقصود ہوتی ہے گویا وہ لائق خطاب نہیں ہیں اس وجہ سے اللہ

نے اپنے رسول کو مخاطب کر کے وہ بات فرمادی جو فرمانی تھی۔ قرآن میں اس طرح کے جو خطاب وارد

ہوئے ہیں بالعموم کلام کے تدریجی ارتقاء سے ان کا اصل رخ بھی واضح ہو گیا ہے۔

(۸۸) عبد اللہ بن معمر کہتا ہے کہ التفات یہ ہے کہ متکلم مخاطبت سے اخبار کی طرف اور اخبار سے مخاطبت کی طرف

پلٹ جائے (البدیع لفظی الحکمی ایڈیشن ۱۳۶۳ھ، ص: ۱۰۶)

(۸۹) جریر، دیوان جریر، الصاوی ۱۳۵۳ھ، ص: ۵۱۲/ ابن المعمر، البدیع، ص: ۱۰۷، العسکری کتاب الصنائع

۱۳۲۰ھ، ص: ۳۱۱/ لسان العرب: ۱۳/۳۱۷، ابن رشیق کتاب العمدۃ، التجاریۃ ۱۳۵۳ھ، ۲/۲۴

(۹۰) دیوان جریر ۵۱۲، البدیع ۱۰۷، لسان العرب ۱۹/۶۸

- (۹۱) دیوان جریر ۳۰۲، البدیع، ص: ۱۰۷، العمدۃ ۲/۲، کتاب الصناعتین: ۳۱۱
- (۹۲) ایسا بھی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے اور آپ کے واسطے ہی تمام لوگوں کو مخاطب کرتا ہے۔ کیوں کہ قرآن پاک میں بکثرت ایسی آیات موجود ہیں جہاں کلام کی یہ توجیہ ممکن نہیں ہے مثال کے طور پر دیکھیے سورۃ المائدہ، آیت: ۱۵، وغیرہ
- (۹۳) مثال کے طور پر سورہ فاتحہ کو دیکھیے جو پوری کی پوری وہ دعا ہے جو بندوں کو اللہ نے سکھائی ہے۔
- (۹۴) اس آیت کی تفسیر میں زبردست اختلاف ہے۔ دیکھیے: تفسیر ابن کثیر ۳/۱۳۲-۱۳۳، شوکانی، فتح القدر ۳/۳۲۲، اس مفہوم کی تائید میں احادیث بھی وارد ہیں۔ دیکھیے: جمع الفوائد، ج: ۲، کتاب القيامة واحوالہا بحوالہ مسلم اور مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی کتاب الفتن فی الحوض والشفاعة۔
- (۹۵) ابن ہشام السیرۃ النبویۃ، ۱۹۵۵ء، ۱/۶۳۸-۶۳۹
- (۹۶) القرشی جمہرۃ اشعار العرب، ص: ۱۰۰ (۹۷) محولہ بالا، ص: ۲۸۶
- (۹۸) النجم سے بعض لوگوں نے زمین پر پیدا ہونے والے چھوٹے چھوٹے جھاڑ اور بیلوں وغیرہ کے قسم کی چیزیں مراد لی ہیں مثال کے طور پر شوکانی نے لکھا ہے کہ النجم ما لا ساق له من النبات والشجر ماله ساق (نجم اس پودے کو کہتے ہیں جس میں تنانہ ہو اور شجر تناوے پودے کو کہتے ہیں) (فتح القدر ۵/۱۳۱)
- (۹۹) اسی مفہوم کو ایک دوسری آیت میں کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔ یس آیت: ۴۰
- (۱۰۰) اگرچہ مفسرین نے ان دونوں میں کسی قدر فرق کیا ہے مثال کے طور پر العلّیٰ کے معنی المتعالی بذاتہ عن الأشباه والانداد (جو نظائر و امثال سے ماوراء ہو) کے ہیں اور العظیم کے معنی الذی یتحققر بالنسبۃ الیہ کل ما سواہ (جس کے مقابلہ میں ہر چیز حقیر اور چھوٹی ہو) کے لیے ہیں (تفسیر ابی السعود ۱/۱۸۹) لیکن معنی اور روح کے اعتبار سے کوئی زیادہ فرق نہیں ہے زختری نے لکھا ہے کہ یہ دونوں الفاظ خدا کی جلالت قدر اور عظمت و مرتبہ کو نمایاں کرنے کے لیے مستعمل ہوئے ہیں (الکشاف: ۱/۲۳۰)
- (۱۰۱) باقلانی نے لکھا ہے کہ حذف کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کچھ الفاظ یا جملے ساقط کر دیے جائیں اور مثال میں یہ آیت پیش کی ہے واسئل القریۃ یعنی اهل القریۃ (اعجاز القرآن، ص: ۳۹۷)
- (۱۰۲) جر جانی، دلائل الاعجاز بتحقیق محمد بن تاویت ۱/۸۶
- (۱۰۳) القرشی، جمہرۃ اشعار العرب، ص: ۲۶۷
- (۱۰۴) محولہ بالا، ص: ۱۸۸ (۱۰۵) محولہ بالا، ص: ۱۲۰
- (۱۰۶) محولہ بالا، ص: ۲۸۸
- (۱۰۷) ابو تمام، دیوان الحماسہ بتحقیق محمد عبد المنعم خفاجی، ۱۹۵۵ء، ۱/۳۶۵
- (۱۰۸) محولہ بالا جلد دوم، ص: ۳۱
- (۱۰۹) محولہ بالا جلد اول، ص: ۲۸۵
- (۱۱۰) مفسرین نے علامہ فراہی کے بقول اس آیت کا صحیح ترجمہ نہیں کیا ہے۔
- (۱۱۱) اکثر لوگ یہاں تقویٰ کے لفظ کو محذوف نہیں مانتے ان کے نزدیک تَزَوَّدُوا کے لفظ سے لوگوں کو حج کے لیے مادی زاد راہ لے کر نکلنے کی تاکید کی گئی ہے۔

(۱۱۲) ابو ہلال عسکری، کتاب الصنائع، ص: ۳۶ بعض کتابوں میں یہ شعر کسی قدر تبدیلی کے ساتھ نقل ہوا ہے
مثلاً شعراء النصاریہ کا مصنف یوں نقل کرتا ہے:

والنوک خیر فی ظلال العیش ممن عاش کذا (ص: ۴۱۷)

(۱۱۳) ابو تمام کتاب الحماسہ ۸۱/۱

(۱۱۴) مشہور مخضرمی شاعر جعفر بن علیہ حارثی کا شعر ہے ابو تمام کتاب الحماسہ ۲۷/۱

(۱۱۵) حضرت حسان بن ثابتؓ نے یہ مرثیہ جنگ موتہ کے شہداء پر کہا تھا۔ دیوان حسان بن ثابت انصاری،

بیروت، ۱۹۶۶ء، ص: ۹۹

(۱۱۶) دیوان امرؤ القیس، بیروت ۱۹۵۸ء، ص: ۱۲۱ (۱۱۷) دیوان حسان بن ثابت انصاری، ص: ۵۸

(۱۱۸) یہ جاہلی شاعر عمرو بن قمیہ کا شعر ہے کتاب الحماسہ بتحقیق عبد المنعم خفاجی ۲/۱۷۔ عام طور پر لوگوں نے ان

مواقع پر اذ کو زائد تصور کیا ہے حالانکہ قرآن میں کوئی لفظ یا حرف بھی زائد نہیں ہے بلکہ اپنے اندر

معانی کا بے کراں سمندر رکھتا ہے۔ دیکھیے ابن ہشام مغنی اللیب ۱/۱۳۴۔ زنجیری، الکشاف ۱/۵۳۳

(۱۱۹) دیوان الممتحنی، ص: ۱۷۱

(۱۲۰) دیوان ابن الرومی مع شرح شیخ محمد شریف سلیم، ۱۹۱۷ء، ۱/۳۸۸

(۱۲۱) محولہ بالا جلد اول، ص: ۳۸۶

(۱۲۲) دیوان البحرتری مع شرح حسن کامل الصیرنی ۱۹۶۲ء، ۳/۲۰۱۰

(۱۲۳) دیوان الممتحنی، ص: ۳۳۷

(۱۲۴) دیوان ابی تمام مع شرح الخطیب التبریزی بتحقیق محمد عبدہ عزام ۲/۱۳۰

(۱۲۵) دیوان الممتحنی، ص: ۳۶۲ (۱۲۶) دیوان البحرتری، ۱/۸۶

(۱۲۷) دیوان الممتحنی، ص: ۳۳۹ (۱۲۸) البلاغۃ الواضحة، ص: ۲۰۵

(۱۲۹) محولہ بالا، ص: ۲۰۱ (۱۳۰) محولہ بالا، ص: ۱۹۷

(۱۳۱) محولہ بالا، ص: ۲۰۴ (۱۳۲) دیوان البحرتری بتحقیق رشید عطیہ بیروت ۱۹۱۱ء، ۱/۲۱۷

(۱۳۳) دیوان ابی تمام مطبع حجازی قاہرہ، ۱۳۶۱ھ، ص: ۲۰۲

(۱۳۴) دیوان امرؤ القیس، بیروت، ۱۹۵۸ء، ص: ۹۵

(۱۳۵) دیوان ابی تمام بتحقیق محمد عبد المنعم خفاجی، ۱۳۷۲ھ، ۱/۶۰۰

(۱۳۶) اشرف علی تھانوی بیان القرآن، جلد ۸، ص: ۲۴ کا حاشیہ دیکھیے

(۱۳۷) دیوان امرؤ القیس دار المعارف، مصر ۱۹۵۸ء، ص: ۳۷۹

(۱۳۸) محولہ بالا، ص: ۹۰ (۱۳۹) محولہ بالا، ص: ۷۴

(۱۴۰) جہرۃ اشعار العرب، ص: ۱۰۲ (۱۴۱) محولہ بالا، ص: ۱۲۷

(۱۴۲) محولہ بالا، ص: ۲۷۷ (۱۴۳) محولہ بالا، ص: ۲۷۸

(۱۴۴) محولہ بالا، ص: ۲۴۲ (۱۴۵) محولہ بالا، ص: ۲۴۴

(۱۴۶) محولہ بالا، ص: ۱۳۳ (۱۴۷) دیوان امرؤ القیس، ص: ۹۶

(۱۴۸) شعراء النصرانیة، ص: ۳۲۰ (۱۴۹) محولہ بالا ص: ۳۲۷

(۱۵۰) مجموعہ تفاسیر فراہی مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان، ص: ۵۶۰

(۱۵۱) شرح دیوان جریر متخفق محمد اسماعیل عبداللہ انصاری ۱۳۵۳ھ، ص: ۳۷۵

(۱۵۲) قرآن اس تشبیہ کو یوں استعمال کرتا ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَا آتَى أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ
الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَّاحُ (کہف: ۴۵)

(اور ان کے لیے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کرو کہ جیسے آسمان سے ہم نے پانی اتارا اور زمین کی
نباتات اس سے سیراب ہو کر خوب اچھیں پھر وہ خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو گئیں جن کو ہوائیں
ادھر ادھر اڑائے لیے پھرتی ہیں)

(۱۵۳) شعراء النصرانیة، ص: ۳۲۳

(۱۵۴) جامع ترمذی مطبع مجیدی کانپور، ابواب البر والصلة، ص: ۲۳

(۱۵۵) سیرت النبی، ابن ہشام الجزء الاول، دار الفکر، ۱۹۳۵ء، ص: ۲۹۸

(۱۵۶) دیوان حسان بن ثابت انصاری، دار صادر، بیروت ۱۹۶۶ء، ص: ۱۸۰

(۱۵۷) جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، ص: ۲۳

(۱۵۸) ان آیات کی تفسیر میں بڑا زبردست اختلاف ہے۔ بعض لوگوں نے تمام آیات کو ہوا پر محمول کیا ہے جس کی
ترجمہ میں رعایت رکھی گئی ہے اور بعض لوگوں نے ملائکہ کو مراد لیا ہے اور کچھ لوگوں نے تفریق کی ہے۔
ابن کثیر نے مرسلات اور عاصفات سے ہواؤں کو اور آگے کی آیات سے ملائکہ کو مراد لیا ہے صاحب
التسہیل نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے محمد علی الصابونی (صفوة التفاسیر ۱۹/۹۱) نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی
ہے لیکن پہلی تاویل زیادہ اقرب الی الصواب معلوم ہوتی ہے۔

(۱۵۹) چنانچہ حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، محمد بن کعبؓ، ابو صالح اور مفسرین کا ایک

طبقہ اس سے مراد اونٹوں کو لیتا ہے لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حسنؓ اور دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ
یہاں گھوڑے مراد ہیں ابن جریر کہتے ہیں کہ ”دونوں اقوال میں سے یہی قول قابل ترجیح ہے کہ دوڑنے
والوں سے مراد گھوڑے ہیں کیوں کہ اونٹ صبح نہیں کرتا گھوڑا ہی صبح کرتا ہے اور اللہ نے فرمایا ہے کہ ”ان
دوڑنے والوں کی قسم جو دوڑتے ہوئے صبح کرتے ہیں“ امام رازی کہتے ہیں کہ ”ان آیات کے الفاظ پکار پکار
کر کہہ رہے ہیں کہ مراد گھوڑے ہیں کیوں کہ صبح کی آواز گھوڑے کے سوا کسی سے نہیں نکلتی اور آگ جھاڑنے
کا فعل بھی پتھروں پر ستموں کی ٹاپ پڑنے کے سوا کسی اور طرح کے دوڑنے سے نہیں ہوتا اور اسی طرح
صبح سویرے چھاپہ مارنا بھی دورے جانوروں کی بہ نسبت گھوڑوں ہی کے ذریعہ سے سہل ہوتا ہے۔“ فرما
اور زجاج کا اختیار کردہ قول یہی ہے۔ (دیکھیے ابن قیم جوزیہ البیان فی اقسام القرآن، ص: ۷۵-۷۹)

(۱۶۰) الاتقان، ج: ۲، ص: ۷۵

(۱۶۱) حوالہ بالا

(۱۶۲) دیوان النابغة الذبیانی، المکتبہ الاہلیة بیروت ۱۹۲۹ء، ص: ۶۹

(۱۶۳) البلاغۃ الواضحة، ص: ۲۵۲

(۱۶۴) محولہ بالا

(۱۶۵) علامہ ابن کثیر اور علامہ زکریا (۴/۲۹) اور متاخرین میں مولانا مودودی (تفہیم القرآن ۴/۳۱۲)

وغیرہ نے یہاں جن سے مراد فرشتوں کو لیا ہے۔ ان کی تاویل کے مطابق یہاں جن اپنے لغوی مفہوم (پوشیدہ مخلوق) میں استعمال ہوا ہے اور ملائکہ بھی اصلاً ایک پوشیدہ مخلوق ہیں۔

(۱۶۶) الاتقان جلد دوم، ص: ۲۲۶

(۱۶۷) دیوان الممتحنی، دیوبند، ص: ۲۳۳

(۱۶۸) دیوان ابن معتر، ص: ۳۶۴

(۱۶۹) جمہرۃ اشعار العرب، ص: ۱۶۶

(۱۷۰) محولہ بالا، ص: ۲۵۱

(۱۷۱) اس آیت کی تاویل میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ نحو یوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں لَمَّا کا جواب

مخذوف ہے اور اس کو سامع کے ذہن پر چھوڑ دیا گیا ہے کیوں کہ بات اتنی بڑی تھی کہ اسے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے تصور کے لیے چھوڑ دینا زیادہ مناسب تھا یعنی جب اللہ نے دیکھا ہوگا کہ بوڑھا باپ اپنے ارمانوں سے مانگے ہوئے بیٹے کو محض ہماری خوشنودی پر قربان کر دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے اور بیٹا بھی گلے پر چھری چلوانے کے لیے راضی ہے تو یہ منظر دیکھ کر کیسا کچھ دویائے رحمت نے جوش مارا ہوگا اور مالک کو ان باپ بیٹوں پر کیسا کچھ پیار آیا ہوگا اس کا بس تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ الفاظ میں اس کی کیفیت جتنی کچھ بھی بیان کی جائے گی وہ اس کو ادا نہیں کرے گی بلکہ اس کی اصلی شان سے کچھ گھٹ کر ہی ہوگی۔ (دیکھیے سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن جلد چہارم، ص: ۲۹۶، ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵،

لیکن جنت کا معاملہ مختلف ہو گا وہ جنتیوں کے انتظار میں کھلے ہوں گے اور انہیں مر جانا کہنے کے لیے بے چین ہوں گے۔ (تفسیر قاسمی ۱۳/۵۱۵۲)

(۱۷۳) علامہ جمال الدین قاسمی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ آخری جملہ پہلے جملے پر معطوف ہے اور کماکانوا کے مفہوم میں ہے اور کما میں تشبیہ و تمثیل کے ساتھ سببیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے (جلد: ۷، ص: ۲۶۹۶)

(۱۷۴) الا لقان، ج: ۲، ص: ۷۱-۷۲

(۱۷۵) بعض لوگوں نے اس جملے کا الٹا مطلب یہ نکال لیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود حضرت زینبؓ سے نکاح کے خواہش مند تھے اور آپ کا جی چاہتا تھا کہ حضرت زینبؓ سے نکاح دے دیں مگر جب انہوں نے آکر عرض کیا کہ میں بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپ نے معاذ اللہ اوپری دل سے انہیں منع کیا اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ”تم دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا“ حالاں کہ اس طرح کی تمام باتیں غلط ہیں۔ ابن کثیر کا یہ تبصرہ بالکل درست ہے کہ:

أحببنا ان نضرب عنها صفحاً لعدم صحتها فلا نوردها (تفسیر ابن کثیر ۳/۴۹۱)

(یہ روایات بے اصل ہیں اس وجہ سے ہم نے ان سے صرف نظر کرنا ہی پسند کیا اور ان کو نقل نہیں کر رہے ہیں)

(۱۷۶) یہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر قریش فرشتوں کو خدا کی نرا اولاد قرار دیتے تو بات صحیح ہوتی اور یہاں فرشتوں کو بیٹیاں قرار دینے پر تہدید کی جارہی ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ اول تو خدا کی طرف بیٹوں اور بیٹیوں کی نسبت ہی ایک شدید قسم کی جہالت ہے لیکن انہوں نے جہالت پر جہالت یہ کی ہے کہ خدا کے لیے انہوں نے وہ چیز پسند کی ہے جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں حالاں کہ عقل و فطرت کا تقاضا اس کے برعکس ہے۔

(۱۷۷) بعض کے نزدیک یہ تبصرہ ان اہل عرب کی طرف سے ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ان کے خیال میں مفسرین کو اس آیت کے سمجھنے میں جو غلطی ہوئی ہے وہ کلام کے سیاق پر غور نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے (دیکھیے: تدبر قرآن جلد ششم، ۱۹۷۸ء، ص: ۲۱۶) لیکن جمہور مفسرین اس کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں اور ان کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو نرم و نازک اور ضعیف و کمزور، ناقص العقل اور اپنی بات پوری طرح واضح نہ کر سکنے والی اولاد ہے وہ تم نے اللہ کے حصے میں ڈال دی اور خم ٹھونک کر میدان میں اترنے والی اولاد خود لے اڑے؟ (دیکھیے ابن کثیر ۴/۱۲۵، شوکانی فتح القدر ۳/۵۲۹ وغیرہ)

اس آیت سے فقہاء نے عورتوں کے لیے زیور کے جواز کا پہلو بھی نکالا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے (تفہیم القرآن ۴/۵۳۱-۵۳۲)

کتابیات

- ۱- ابن کثیر و منهجه فی التفسیر، ڈاکٹر اسماعیل سالم عبدالعال، مکتبه ملک فیصل الاسلامیہ ۱۹۸۲ء
- ۲- الاتقان فی علوم القرآن، سیوطی، مصر ۱۲۷۹ھ
- ۳- احکام القرآن۔ ابو بکر جصاص، مصر ۱۳۲۷ھ
- ۴- اسالیب القرآن۔ حمید الدین فراہی، اعظم گڑھ ۱۳۸۹ھ
- ۵- اسباب النزول۔ علی بن احمد الواحدی النیسابوری۔ قاہرہ، ۱۹۶۸ء
- ۶- اعجاز القرآن والبلاغۃ النبویۃ، مصطفیٰ صادق رافعی، مصر - ۱۳۸۹ھ
- ۷- اعجاز القرآن۔ عبدالکریم الخطیب، دارالفکر العربی، ۱۳۷۳ھ
- ۸- اعجاز القرآن، الباقلائی، بتحقیق السید احمد الصقر، دارالمعارف، مصر
- ۹- امالی المرتضیٰ، تحقیق مجد ابو الفضل ابراہیم، دار احیاء الکتب العربیہ قاہرہ، ۱۹۵۲ء
- ۱۰- امثال القرآن، شمس الدین ابن قیم الجوزیہ، مکة المکرمہ ۱۹۸۰ء بعنایہ ناصر الرشید
- ۱۱- بحث فی ترجمۃ القرآن الکریم و احکامہا، محمد مصطفیٰ المراغی، بیروت ۱۹۸۱ء
- ۱۲- البرہان فی علوم القرآن، بدرالدین محمد عبداللہ زرکشی، تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸م
- ۱۳- بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز، مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی
- ۱۴- بلاغۃ القرآن، محمد الخضر الحسین، دمشق ۱۹۷۱ء
- ۱۵- تاریخ فکرۃ اعجاز القرآن، نعیم الحمصی، المجمع العلمی العربی دمشق ۱۹۵۰ء
- ۱۶- تاریخ القرآن، محمد طاہر بن عبدالقادر الکروی، قاہرہ الحلبی ۱۹۵۳ء
- ۱۷- تاریخ القرآن، عبدالصبور شاہین، قاہرہ ۱۹۶۶ء
- ۱۸- تاویل مشکل القرآن، ابن قتیبہ ۱۳۷۳ھ
- ۱۹- التبیان فی اقسام القرآن، ابن قیم، مکتبہ التجاریۃ الکبریٰ، قاہرہ ۱۹۳۳ء

- ٢٠- التبيان في علوم القرآن- محمد علي الصابوني، دار الارشاد ١٩٤٠ء
- ٢١- تبصير الرحمن و تيسير المنان، محمود علي المهانمي، مطبعة بولاق، مصر
- ٢٢- التصوير الفني في القرآن، سيد قطب شهيد، الطبقة الثالثة، مصر
- ٢٣- التعريف والاعلام بما انبئهم في القرآن عن الاسماء والاعلام، ابوالقاسم عبدالرحمن السهيلي
- ٢٤- تفسير ابن كثير طبعة عيسى الحلبي ١٢٢٥هـ - ١٣٢٤هـ
- ٢٥- تفسير ابوالسعود المسمي ارشاد العقل السليم الى مزايا القرآن الكريم- مطبعة محمد علي صبيح، قاهره
- ٢٦- تفسير بيضاوي، قاضي نصير الدين شيرازي بيضاوي، المطبعة العثمانية، مصر ١٣٠٥هـ
- ٢٧- التفسير البياني للقرآن الكريم، عائشه عبدالرحمن بنت الشاطي، دارالمعارف، قاهره ١٩٦٢ء
- ٢٨- التفسير الحديث، محمد عزه دروزه، دار احياء الكتب العربية ١٣٨١هـ / ١٩٦٢ء
- ٢٩- تفسير الخازن، مطبعة بولاق، الطبعة الاولى
- ٣٠- تفسير القاسمي المسمي به محاسن التاويل، محمد جمال الدين قاسمي، دار احياء الكتب العربية ١٩١٣ء
- ٣١- تفسير القرآن بكلام الرحمن، ثناء الله امرتسري، امرتسر ١٣٢١هـ
- ٣٢- تفسير كبير، فخر الدين رازي، مطبوعه ١٣٠٨هـ
- ٣٣- تفسير المراغي، احمد مصطفى المراغي، مطبعة مصطفى البابي ١٩٥٣ء
- ٣٤- تفسير مظهرى، قاضي ثناء الله پانى پتى، ندوة المصنّفين، دهلي
- ٣٥- التفسير الموضوعي للقرآن الكريم، محمد البهي، مكتبه وهبه، قاهره ١٩٤٦م
- ٣٦- التفسير الميسر، عبدالله خياط، مكتبه النجاح، جدّه ١٣٩٢هـ
- ٣٧- تفسير سوره اخلاص، ابن تيميه، المطبعة الحسينية المصرية ١٣٢٢هـ
- ٣٨- تفسير سوره بقره، ذاكتر مصطفى زيد ١٩٦٢ء
- ٣٩- التفسير معالم حياته منهجته اليوم، استاذ امين الخولى، جماعة الكتاب ١٩٢٢ء
- ٤٠- التفسير و رجاله، شيخ محمد فاضل بن عاشور، سلسله البحوث الاسلامية ١٣٩٠هـ / ١٩٤٠م
- ٤١- التفسير والمفسرون، استاذ محمد حسين الذهبي، دارالكتب الحديثه ١٣٨١هـ / ١٩٦١ء

- ۲۲- تفصیل آیات القرآن الکریم، محمد فواد عبدالباقی، مصر
- ۲۳- التقرير فی التکریر، محمد ابوالخیر عابدین
- ۲۴- التکمیل فی اصول التأویل، حمید الدین فراہی، اعظم گڑھ ۱۳۸۸ھ
- ۲۵- تنزیہ القرآن عن المطاعن، القاضی عبدالجبار بن احمد المعتزلی، بیروت
- ۲۶- جامع البیان عن تاویل آیات القرآن، ابو جعفر محمد بن جریر طبری،
مطبعہ مصطفیٰ الحلبي ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳م
- ۲۷- الجامع الأحكام القرآن، ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبي،
قاہرہ ۱۹۲۵ء
- ۲۸- دلائل النظام، حمید الدین فراہی، اعظم گڑھ ۱۳۸۸ھ
- ۲۹- دلائل الاعجاز عبدالقاهر جرجانی تحقیق محمد بن تاویت
- ۵۰- روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ابوالفضل شہاب
الدین آلوسی مطبعة لولاق ۱۳۰۱ھ
- ۵۱- زادالمسیر فی علم التفسیر، ابن الجوزی، بیروت، ۱۹۲۵ء
- ۵۲- سورة الاحزاب عرض و تفسیر، ڈاکٹر مصطفیٰ زید، دارالفکر العربی
۱۳۸۹ھ / ۱۹۲۹م
- ۵۳- الصحابی فی فقہ اللغہ و سنن العرب فی کلامہا، احمد بن فارس، مکتبہ
سلفیہ قاہرہ ۱۹۱۰ء
- ۵۴- صفوة التفاسیر، محمد علی الصابونی، دارالقرآن الکریم، بیروت ۱۹۸۱ء
- ۵۵- ضبط اسماء الانبیاء علیہم السلام الذین ذکروا فی القرآن، احمد العدوی
- ۵۶- طبقات المفسرین، سیوطی، طبعة طهران ۱۹۲۰ء
- ۵۷- عمدة التفسیر، احمد محمد شاکر، دارالمعارف ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲م
- ۵۸- فتح القدير بين فنی الروایة والدرایة من علم التفسیر، محمد بن علی
شوکانی، مطبعة مصطفیٰ البابی، قاہرہ ۱۳۸۳ھ / ۱۹۶۳م
- ۵۹- فتح المنان فی بیان مشاہیر الرسل فی القرآن، احمد السجاعي
- ۶۰- الفوائد المشوق الی علوم القرآن، سیوطی
- ۶۱- الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، شاہ ولی اللہ، لاہور ۱۹۵۱ء
- ۶۲- فی ظلال القرآن ۳۰ حصے سید قطب شہید، قاہرہ الطبعة الثانية
- ۶۳- القرآن و الطبائع النفسیة، علی محمد حسن العماری ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء
- ۶۴- القرآن و علم النفس، حمودہ عبدالوہاب، دارالقلم، قاہرہ ۱۹۶۲ء

- ٢٥- قصة التفسير، شيخ احمد الشرباص، سلسلة المكتبة الثقافية ١٩٢٢ء
- ٢٦- الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل، زمخشري، مطبعة الاستقامة قاهره ١٩٢٦م
- ٢٧- مباحث في علوم القرآن، مناع القطان، الدارالسعودية للنشر
- ٢٨- مبادئ التفسير، شيخ محمد الخضرمي، مطبعة النيل ١٣٢١هـ / ١٩٠٣م
- ٢٩- مجموعه تفسير شيخ الاسلام ابن تيميه مطبعة (ق) بمبني ١٣٤٣هـ / ١٩٥٢م
- ٤٠- مدخل الى القرآن الكريم، محمد عبدالله دراز، كويت ١٩٤١م
- ٤١- مسألة ترجمة القرآن الكريم، شيخ الإسلام مصطفى صبري، قاهره ١٣٥١هـ
- ٤٢- مع القرآن الكريم في تاريخه و خصائصه و احكامه، شعبان محمد اسماعيل، قاهره، ١٩٤٨ء
- ٤٣- معترك الاقرآن في اعجاز القرآن، سيوطي، قاهره ١٩٢٩ء، بعناية علي محمد البجاوي
- ٤٤- المرشد الى آيات القرآن الكريم و كلماته، محمد فارس بركات، طبع دوم ١٩٥٤ء
- ٤٥- مع المفسرين والكتاب، استاذ محمد احمد جمال، دارالكتاب العربي ١٣٤٣هـ / ١٩٥٢م
- ٤٦- المعجم المفهرس لالفاظ القرآن الكريم، محمد فؤاد عبدالباقي، مطابع الشعب ١٣٤٩هـ
- ٤٧- معجم آيات القرآن، ذاكتر حسين نصار، مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر ١٣٤٣هـ / ١٩٥٢م
- ٤٨- مع القرآن العظيم، استاذ محمد لبيب البوهي، دارالطباعة الحديثه
- ٤٩- معالم التنزيل، تقوي، مطبوع علي هامش تفسير ابن كثير، طبعة المنار
- ٨٠- مفتاح التفاسير، حافظ محمد شريف، ١٢٩٩هـ
- ٨١- المفردات في غريب القرآن، راغب اصفهاني، مصر ١٩٢١ء
- ٨٢- مقدمة في اصول التفسير، ابن تيميه، مطبع الترقى دمشق
- ٨٣- من بلاغة القرآن، احمد احمد بدوي مكتبه نهضة، مصر، الطبعة الثانية
- ٨٤- مناهل العرفان في علوم القرآن، الجزء الاول والثاني، محمد عبدالعظيم الزرقاني ١٣٤٢هـ / ١٩٥٣ء
- ٨٥- منهج الزمخشري في تفسير القرآن، ذاكتر مصطفى الجويني، دارالمعارف ١٩٢٨ء
- ٨٦- النبأ العظيم، ذاكتر محمد عبدالله دراز، مكتبه السعادة، مصر ١٩٥٤ء
- ٨٧- النسخ في القرآن الكريم، ذاكتر مصطفى زيد، دارالفكر العربي ١٣٨٣هـ

- ۸۸- نشأة التفسير في الكتب المقدسه والقرآن، ڈاکٹر سید احمد خليل ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۲ء
- ۸۹- نظرات في القرآن، محمد الغزالي، المكتب التجاري، بيروت ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء
- ۹۰- نظم الدرر في تناسب الآيات والسور، برهان الدين ابوالحسن ابراهيم بن عمر بقاعي دائرة المعارف حيدر آباد دکن ۱۹۷۸ء
-
- ۹۱- ايمان العرب في الجاهلية، ابو اسحاق بحتري، تحقيق محب الدين الخطيب
- ۹۲- البديع، عبدالله بن معتز، شرح و تعليق محمد عبدالمنعم خفاجي، مطبعة مصطفى البابي
- ۹۳- البلاغة الواضحة، علي حازم و مصطفى امين، دارالمعارف، مصر ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۶م
- ۹۴- تاج العروس، سيد محمد مرتضى زبيدي، دار ليبيا للنشر والتوزيع، بيروت ۱۹۶۶م
- ۹۵- ترمذی، مطبوعه رشيديه دهلي
- ۹۶- التكميل في اصول التأويل، حميد الدين فراہی، اعظم گڑھ ۱۳۸۸ھ
- ۹۷- جمع الفوائد من جامع الاصول، مطبوعه خيريه ميرٹھ ۱۳۲۶ھ
- ۹۸- جمهرة اشعار العرب، ابو زيد محمد بن عبد ابو الخطاب القرشي، دار بيروت ۱۹۶۳ء
- ۹۹- جمهرة البلاغة، حميد الدين فراہی، معارف اعظم گڑھ ۱۳۲۰ھ
- ۱۰۰- جمهرة خطب العرب في عصور العربية الزاهرة، احمد ذكي صفوت، قاهره ۱۹۳۲م
- ۱۰۱- حياة محمد، ڈاکٹر محمد حسين بيگل، طبعة السنة المحمدية ۱۹۶۳ء
- ۱۰۲- ديوان ابن الرومي، شرح شيخ محمد شريف سليم ۱۹۷۱م
- ۱۰۳- ديوان ابن معتز، دار بيروت للطباعة والنشر ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء
- ۱۰۴- ديوان ابي تمام، شرح الخطيب التبريزي، تحقيق محمد عبده عزام
- ۱۰۵- ديوان امرء القيس، دار بيروت للطباعة والنشر ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸م
- ۱۰۶- ديوان أوس بن حجر، تحقيق و شرح ڈاکٹر يوسف نجم، دار صادر بيروت ۱۹۶۰م
- ۱۰۷- ديوان البحتري، شرح حسن كامل الصيرفي ۱۹۶۳م
- ۱۰۸- ديوان جرير، دار صادر بيروت ۱۹۶۰م
- ۱۰۹- ديوان حسان بن ثابت انصاري، بيروت ۱۹۶۶م
- ۱۱۰- ديوان الحماسة، ابو تمام، تحقيق محمد عبدالمنعم خفاجي ۱۹۵۵م
- ۱۱۱- ديوان زهير بن ابي سلمى، دار صادر بيروت ۱۹۵۳م
- ۱۱۲- ديوان عبید بن الابرص، دار بيروت ۱۹۵۸م

- ١١٣- ديوان المتنبي ١٢١٤هـ
- ١١٤- ديوان النابغة الذبياني، مطبع مصباح بيروت ١٣٢٤هـ / ١٩٢٩م
- ١١٥- روح الدين الاسلامي، عفيف عبدالفتاح طباره، قاهره ١٩٥٩ء
- ١١٦- السيرة النبوية، ابو محمد عبدالملك بن هشام، مطبعة مصطفى البابي قاهره ١٩٥٥ء
- ١١٧- شرح ديوان امرء القيس، هندوستانی ايڈيشن ١٣٢٢هـ
- ١١٨- شرح ديوان جرير، تحقيق محمد اسماعيل عبدالله الصاوي ١٣٥٣هـ
- ١١٩- الشراء الصعاليك في العصر الجاهلي، دكتور يوسف خليف، دارالمعارف، مصر ١٩٥٩م
- ١٢٠- شعراء النصرانية بعد الاسلام، لويس شيخو اليسوعي، المطبعة الكاثوليكية للآباء
- ١٢١- اليسوعيين بيروت ١٩٢٢ء
- ١٢٢- شعراء النصرانية قبل الاسلام، لويس شيخو اليسوعي، مطبعة الآباء المرسلين اليسوعيين بيروت ١٨٩٠م
- ١٢٣- العمدة، ابن رشيق القيرواني، المكتبة التجارية الكبرى ١٩٣٢م
- ١٢٤- فقه السيرة، محمد الغزالي، قاهره ١٩٥٢م
- ١٢٥- القائد الى عيون العقائد، حميد الدين فراهي، اعظم كثره ١٣٩٥هـ / ١٩٤٥م
- ١٢٦- الكتاب - سيبويه، مكتبة الامبريه بولاق مصر ١٣١٢هـ
- ١٢٧- كتاب الاشارة الى الايجاز بعض انواع المجاز
- ١٢٨- كتاب الأغاني، ابو الفرج اصفهاني، دار الثقافة بيروت ١٩٥٤م
- ١٢٩- كتاب الامثال، ابو منصور عبدالملك ابن محمد بن اسماعيل، دارالكتب العربية، مصر
- ١٣٠- كتاب الحيوان، ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ، مكتبة مصطفى البابي الحلبي، مصر
- ١٣١- كتاب الصناعتين، ابو هلال الحسن بن عبدالله بن سهل العسكري دار احياء الكتب العربية، قاهره ١٩٥٢ء
- ١٣٢- لسان العرب، ابن منظور دار الطباعة والنشر ١٩٥٥م - ١٩٥٦م
- ١٣٣- مختارات، ابن الشجري، تحقيق محمد حسن زنايتي ١٩٣٥ء
- ١٣٤- المخصّص، ابو الحسن علي بن اسماعيل ابن سيده، بيروت
- ١٣٥- مشكوة المصابيح، ولي الدين محمد عبدالله تبريزي

- ۱۳۶- المفضلیات، شرح حسن السندوبی، ابوالعباس المفضل بن محمد الضبی
المکتبة التجاریة الكبرى، مصر ۱۳۲۵ھ
- ۱۳۷- المهمل، فواد افرام البستانی، بیروت ۱۹۳۹م
- ۱۳۸- نزہة الخواہر و بہجة المسامع والنواظر، عبدالحنی بن فخر الدین الحسنی،
دائرة المعارف حیدر آباد ۱۹۲۷م
- ۱۳۹- هذه سبیلی، ترجمان جامعة الامام محمد بن سعود، الرياض، ۱۹۸۲ء

- ۱۴۰- اسلام اور عصر جدید، سہ ماہی، ڈاکٹر سید عابد حسین، جولائی ۱۹۷۶ء
- ۱۴۱- الاصلاح، ماہنامہ، امین احسن اصلاحی، مارچ، اپریل، مئی ۱۹۳۶ء اعظم گڑھ
- ۱۴۲- اقسام القرآن، حمید الدین فراہی، مکتبہ چراغ راہ، کراچی ۱۹۵۳ء
- ۱۴۳- الفاظ القرآن، فقیر اللہ لاہوری، لاہور۔ ۱۳۳۱ھ
- ۱۴۴- برناباس، آسی ضیائی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۲ء
- ۱۴۵- بیان القرآن۔ اشرف علی تھانوی۔ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند
- ۱۴۶- تجارتی سود۔ تاریخی اور فقہی نقطہ نظر سے۔ فضل الرحمن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۷ء
- ۱۴۷- تدبر قرآن۔ اول تا ہشتم، امین احسن اصلاحی۔ فاران فاؤنڈیشن لاہور ۱۹۶۷ء-۱۹۸۰ء
- ۱۴۸- ترتیب نزول قرآن۔ پروفیسر محمد اجمل خاں ایم اے۔ کتاب گھرالہ آباد ۱۹۴۱ء
- ۱۴۹- ترجمان القرآن اول تا چہارم۔ ابوالکلام آزاد، ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی ۱۹۶۲-۱۹۷۰ء
- ۱۵۰- تفسیر قرآن۔ سر سید احمد خاں۔ رفاہ عام پریس لاہور
- ۱۵۱- تفہیم القرآن۔ اول تا ہشتم، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۵۸ء
- ۱۵۲- جواز سود مع فتاویٰ۔ سید طفیل احمد منگلوری، بدایوں ۱۹۳۵ء
- ۱۵۳- حقیقۃ الربا۔ اقبال سہیل۔ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۶ء
- ۱۵۴- الحقوق والفرائض۔ حافظ محمد نذیر احمد۔ کہنہ لیتھو پریس دہلی
- ۱۵۵- دعوت دین اور اس کا طریق کار۔ امین احسن اصلاحی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی
- ۱۵۶- رسول اکرم کی حکمت انقلاب۔ سید اسعد گیلانی۔ کریسنٹ پبلشنگ کمپنی علی گڑھ
- ۱۵۷- ریاض القرآن۔ محمد عزیز الدین۔ کشمیری بازار۔ لاہور ۱۹۲۹ء
- ۱۵۸- سیارہ ڈائجسٹ۔ قرآن نمبر حصہ اول و دوم۔ نعیم صدیقی۔ لاہور
- ۱۵۹- سیرت سرور عالم۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ لاہور ۱۹۸۰ء
- ۱۶۰- قصص القرآن۔ حفظ الرحمن سیوہاروی۔ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی
- ۱۶۱- لغات القرآن۔ عبدالرشید نعمانی و عبدالدائم جلالی۔ ندوۃ المصنفین دہلی

- ۱۶۲- مبادی تدبر قرآن۔ امین احسن اصلاحی۔ مکتبہ چراغِ راہ کراچی
- ۱۶۳- مجموعہ تفاسیر فراہی۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی لاہور۔ پاکستان
- ۱۶۴- مشکلات القرآن۔ داؤد اکبر اصلاحی۔ دانش گاہ پنجاب فرنگ لاہور
- ۱۶۵- مفتاح کنوز القرآن۔ کاظم بک کارخانہ وطن لاہور ۱۹۳۷ء
- ۱۶۶- مقالات سلیمان۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۷۱ء
- ۱۶۷- نجوم الفرقان۔ فلوگل۔ فیض بخش ایجنسی۔ فیروز پور ۱۹۰۷ء
- ۱۶۸- نظام القرآن۔ حمید الدین فراہی۔ دائرہ حمیدیہ اعظم گڑھ
- ۱۶۹- ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں۔ پروفیسر محمد سالم قدوائی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۷۳ء

قرآن مجید کے ادبی اسالیب

عبداللہ فہد فلاحی



Q
297.16
ف 848 ق
95687